سرگزشت

متاع زندگی

سردار محمد ابراہیم خان
سابق صدر حکومت آزاد کشمیر



متاعِ زندگی

اپنی پیاری ماں کے نام

جن کی شفقت نے مجھے احساسِ زندگی بخشا۔۔۔۔۔

ماں کی آغوش اور مادرِ وطن

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ
تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ
وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ
بِالصّٰلِحِیْنَ ۝

قرآن حکیم (۱۲-۱۱)

"پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا سکھایا۔ اے آسمان وزمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ـــــ ایسا کیجو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔"

Sardar Muhammad Ibrahim Khan
(April 10, 1915 - July 31, 2003)

also known as Bani-e-Kashmir "Father of Kashmir" and Ghazi-e-Millat "Hero of Nation", was the founder and first President of Azad Kashmir. Born in Hornamera, a village of District Poonch of Kashmir, Sardar Ibrahim obtained his LLB from the University of London in 1943, and began his practice as a prosecutor in 1943 at Mirpur. He completed his BVC from Lincoln's Inn and became the first Barrister of Kashmir. He was appointed as assistant advocate general in 1944 by the then Maharaja of Kashmir. He left the government job in line with the liberation of Kashmir movement, and contested the 1946 elections with sweeping victory that made him the Member of Rajiha Sabha. He led an army of Kashmiri guerrillas against the Maharaja of Kashmir, Hari Singh, after passing the resolution for Kashmir's accession to Pakistan in 1947, at his residence. Sardar and his army were unable to capture the whole Kashmiri Territory due to the resolution passed by United Nations on August 13, 1948. However, the captured area was named as Azad Kashmir and Khan was elected as its first President at the age of 32. He represented Kashmir in different capacities in the United Nations from 1948 to 1971.

حصّہ اوّل

ریاست جموّں وکشمیر کے مغرب میں ایک چھوٹی سی تاریخی ریاست تھی جو کہ پونچھ کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ اب اس ریاست کا کچھ حصّہ آزاد کشمیر کے پاس ہے اور باقی ماندہ علاقہ حکومت مقبوضہ کشمیر کی تحویل میں ہے کہتے ہیں کہ یہ ریاست نہ تو ریاست جموّں کشمیر کا حصّہ تھی اور نہ ہی اس کے زیر اثر البتہ یہاں پر حکومتِ لاہور کی عملداری تھی۔

۱۸۴۶ء کے بعد انگریزی حکومت کی امداد اور حمایت سے ریاست جموّں کشمیر میں جب ڈوگروں کا مکمل تسلّط ہو گیا تو پونچھ کے عوام نے ڈوگروں کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس علاقہ کے لوگوں کی یہ جنگ جموّں کی ڈوگرہ حکومت کے ساتھ ایک عرصہ تک جاری رہی۔

انجام کار ڈوگرہ حکومت نے اپنے وحشیانہ طریقوں اور فرنگیوں کے ذرائع سے اس علاقہ کو اپنے زیر کر لیا۔ جس کے بعد اس سر زمین میں اتنا ظلم و تشدّد روا رکھا گیا کہ یہاں کے زندہ انسانوں کی کھالیں تک اتاریں گئیں! مگر ان بہادر انسانوں نے مرتے دم تک اس جابر حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔

اسی ریاست پونچھ کے مغرب میں ایک علاقہ "باغ وسدھنوتی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ دریائے جہلم کے اس پار اور پاکستان کی سرحد

کے ساتھ ساتھ ضلع میرپور تک چلا گیا ہے۔ تحصیل سدھنوتی کے لوگ سدھن کہلاتے ہیں۔ اس علاقہ میں یہی لوگ بڑی کثرت کے ساتھ آباد ہیں۔ اسی کثرتِ آبادی کی وجہ سے یہ تحصیل "سدھنوتی" کہلاتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ یہ لوگ افغان قبیلہ سدوزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ ہوا کہ یہ لوگ دریائے جہلم عبور کر کے اس علاقہ میں وارد ہوئے۔ پھر ان کی آبادی دور دور تک پھیلتی گئی۔

علاقہ سدھنوتی کی سرزمین بڑی دل کش اور حسین ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ جن میں کئی تو نو دس ہزار فٹ تک کی بلندی رکھتے ہیں۔ ان پہاڑوں پر مختلف قسم کے سرسبز درخت اگتے ہیں یہاں اور ان ہی خوب صورت درختوں کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ہزاروں وادیاں بنتی چلی گئی ہیں اور یہ وادیاں ان کہساروں کے درمیان ایک حسین و جمیل خطۂ ارضی کا نمونہ ہیں۔ یہاں میٹھے چشمے ابلتے ہیں۔ جن کا پانی دل کو موہ لینے والی چھوٹی چھوٹی ندیوں میں تبدیل ہو کر دریائے جہلم میں جا ملتا ہے۔

اس علاقہ کی آب و ہوا بھی اسی طرح دل پسند ہے۔ یہاں سردیوں میں کثرت سے برف پڑتی ہے۔ دو ماہ تک یہاں کے لوگ اپنے گھروں کے اندر ہی اپنا وقت گزارتے ہیں۔ جب سردیوں میں چیڑھ اور دیار کے سدا بہار درختوں سے ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی نکلتی ہے تو نہایت ہی دل فریب موسیقی پیدا کرتی ہے۔ تمام بڑے بڑے پہاڑ سردیوں میں برف سے ڈھکے رہتے ہیں جب چڑھتے ہوئے سورج کی کرنیں ان بلند قامت پہاڑوں پر پڑتی ہیں تو انسانی نظر کے لئے ایک دلکش اور خوب صورت سماں پیدا کر دیتی ہیں۔

یہاں سب سے پیارا موسم بہار کا ہوتا ہے جب سردیوں کی برفانی اور طویل راتوں سے چھٹکارا ملتا ہے تو سورج کی تیز اور پیاری گرماہٹ سے برف پہاڑوں پر دھیرے دھیرے پگھلنے لگتی ہے۔ یہ برف پگھل کر چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ندی نالے اپنی سریلی

آوازوں سے ان دلفریب وادیوں کو عجیب زندگی بخشتے ہیں۔ برف پگھل جانے کے بعد ان پہاڑوں پر نرم و نازک گھاس اگنے لگتی ہے اور یہ گھاس اگ کر ان پہاڑوں پر قالین کی طرح بچھ جاتی ہے۔

پھر کئی قسم کی جھاڑیاں ندی نالوں کے کنارے ان وادیوں میں اگ آتی ہیں۔ ان جھاڑیوں کے درمیان رنگارنگ قسم کے پیارے پیارے پھول بافراط کھل اٹھتے ہیں اور سردی کی ہزار کوفتوں کے باوجود یہ مناظر اس علاقہ کو واقعی بہشت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب گرمی کا موسم آتا ہے تو یہاں کے ابلتے ہوئے چشمے اس قدر میٹھے اور ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ باہر سے آنے والے انسان بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔

"میرا گھرانا ــــــ!"

اسی حسین سرزمین کے ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں میں نے جنم لیا۔ میری پیاری ماں مجھے بڑے پیار سے بتایا کرتی تھیں کہ اس بہار کے موسم میں چمکتے ہوئے سورج کے دنوں میں میں نے دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں جن میں میں ساتواں ہوں۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے۔ تین بہنیں میری پیدائش سے پہلے جنم لے چکی تھیں۔ میرے والدین کی خواہش بے قراری کی حد تک پہنچ چکی تھی کہ اب ایک بیٹا پیدا ہو۔ میں نے اپنے والد سے کئی بار سنا کہ میری فلاں بہن (جو بڑی مضبوط تھیں) اگر بیٹا ہو جاتی تو کیا اچھا ہوتا! میرے والد کو یہ بڑی حسرت رہی کہ ان کے ہاں زیادہ بیٹے کیوں نہیں ہوئے ہم تین بھائی ہیں اور پانچ بہنیں ہیں۔ والد صاحب کے اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافی لمبی چوڑی زمینوں کے مالک تھے

اور انہیں مرتے دم تک یہ فکر دامنگیر رہی کہ ممکن ہے کہ ان کے بیٹے ان زمینوں کو نہ سنبھال سکیں! میرے والد کو زمین سے بے حد پیار تھا! تھوڑی سی زمین کے لئے برسوں مقدمے لڑتے رہے۔ عدالتوں کی جانکاہ کوفتیں اٹھائیں۔ ان مقدموں کے دوران ایسی ایسی سخت مصیبتیں اٹھائیں کہ آج مجھے وہ یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بہرحال میری پیدائش پر اتنی خوشی ضرور ہوئی کہ ایک بیٹا ہوا۔ ورنہ جہاں پہلے چھ بھائی بہن ہوں وہاں ایک اور کا ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ابتدائی پرورش گاؤں کے ایک عام بچے کی طرح ہوئی۔ ایک چھوٹے گاؤں میں زمینداروں کو ہزاروں دھندوں کی مصروفیت رہتی ہے۔ بچے پیدا ہوتے ہیں تو قدرت ان کو اپنی مہربانیوں سے زیادہ پرورش کرتی ہے۔ والدین تو صرف بڑی بڑی ضرورتیں مجبوراً مہیا کرتے ہیں۔ ورنہ چڑیا کے بچے، شیر کے بچے اور انسانوں کے بچے ان دور افتادہ جنگلوں میں کس ناز و نعمت سے فیضیاب ہو سکتے ہیں!

البتہ یہاں کا قدرتی ماحول، یہاں کی آب و ہوا اور یہاں کے دلفریب پہاڑی مناظر ہر بچے کے ذہن اور زندگی کا پس منظر بن جاتے ہیں۔ یہ بڑی نعمت ہے جس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ یہ قدرتی مناظر ان بچوں کے تخیل اور زندگیوں پر ایک عجیب قسم کا اثر چھوڑتے ہیں۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا تخیل اور میری سوچ بچار کا پس منظر ہمیشہ یہی بلند قامت پہاڑ اور یہی بہتی ہوئی دلفریب ندیاں رہی ہیں۔ مجھے یہ ندی نالے اور برفانی پہاڑ ایک عجیب سا پیغام زندگی دیتے رہتے ہیں۔ وہ ذہنی قید یا ذہن کی پابندی جو شہری ماحول سے پیدا ہو جاتی ہوگی۔ وہ ہم لوگوں کے ذہنوں میں بہت کم ملے گی اور غالباً اسی ماحول کا یہ اثر ہے کہ پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کی گہرائیاں ان پہاڑی بچوں میں ایک وسعت قلب پیدا

کر دیتی ہیں۔

ایک دکھی اور محکوم زندگی ہونے کے باوجود بھی ایک گہرا ضبط و صبر یہاں کے انسانوں میں پایا جائے گا۔ اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ وادئ کشمیر کے لوگ بے حد ذہین اور حساس واقع ہوئے ہیں۔ لیکن صدیوں کے ظلم و تشدد اور مصائب کو بے حد صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرتے رہے ہیں۔ میں بسا اوقات یہ سوچتا ہوں کہ سردی اور غلامی کے بے رحم مصائب نے ریاست کشمیر کے لوگوں کو صبر اور جذبات پر قابو پانے کا سبق مسلسل صدیوں نے دیا ہے اور جس قدر ان پر مظالم ڈھائے گئے ہیں اس کی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

میں سب بہن بھائیوں سے بدن میں دبلا اور طبیعت کا تیز ہوں مگر شکر ہے اللہ نے سب بہن بھائیوں میں مجھے ذہانت اور قسمت میں بلند کیا۔ میرے والد خود پڑھے لکھے نہیں تھے۔ البتہ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں انہیں ایک نیک دل اور صحیح زمیندار کی طرح اپنی زمین سے قدرتاً الفت تھی اور اپنی اولاد سے اس سے بھی زیادہ لگاؤ تھا۔ میرے والد نے سب سے پہلے اپنے بچوں کو نہایت ہی دل چسپی اور اپنی ذاتی نگرانی میں ابتدائی تعلیم دلوائی بچوں کو تعلیم دلانے کا انہیں بے حد شوق تھا۔ ان ایام میں میلوں تک پیدل چل کر ایک سکول ہوا کرتا تھا۔ جب میں سکول میں پرائمری تعلیم کے لئے گیا، تو مجھے ہر روز چار میل کا سفر آنے جانے میں طے کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت میری عمر غالباً دس گیارہ سال کی ہو گی۔ اور بسا اوقات جوتی بھی جلدی چھٹ جاتی تھی کہ والدین کو توجہ دلاتے ہی ہفتے گزر جاتے تھے۔ گاؤں میں زندگی شہروں کی زندگی سے بے حد مختلف ہوتی ہے۔

اگرچہ اس زمانے میں یعنی ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ جبکہ عام لوگوں کو بچوں کی تعلیم سے بہت ہی کم دل چسپی ہوتی تھی، میرے ذہن میں آنا

ہے اس زمانے کا ماحول یہ ہو گا کہ اگر بچہ زمیندار کے مال مویشی سنبھال لے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام گھر کے کرے تو زمیندار کے لئے یہ بھی بڑی بات ہو گی مگر ہم بہن بھائیوں کے لئے کس قدر مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے والد نے ہر ایک کی تعلیم کا صحیح بندوبست کیا۔ بہر حال کسی کو زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور کسی کو کم۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میرے والد کے لئے اس سے عظیم کام کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ آج بھی میرے والد کی اپنی زمین (جو نہایت خوبصورت مقام پر واقع ہے) اتنی ہے کہ ایک گھوڑسوار ایک دن میں اس کے گرد چکر نہیں کاٹ سکتا۔ یہ ساری زمینیں میرے والد نے اپنی ذہانت، قابلیت اور محنت سے پیدا کیں۔ جن سے آج ہم سب بہن بھائی مستفید ہو تے ہیں۔ میرے والد نے اپنی بساط کے مطابق گاؤں والوں کے کئی چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دیئے جن کا اہل گاؤں کو اعتراف تھا۔ سارے گاؤں والے ان کو عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ یہاں میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میرے باپ کوئی بڑے زمیندار یعنی "لینڈ لارڈ" کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات ہرگز نہ تھی مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کی شرافت، سیرت اور محنت علاقہ بھر میں مشہور تھی۔

اپنی ماں کی یاد مجھے بڑی پیاری ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں جس کا آج میں ہی ذکر کرنے لگا ہوں۔ ہر بچے جسے اپنی ماں کی ممتا نصیب ہوئی اسے احساس ہوتا ہے کہ ماں کی پیاری محبت کس طرح سے انسان کے رگ وریشے میں موجزن ہوتی ہے۔ میری والدہ کی طبیعت کا اتار چڑھاؤ اور تھا جبکہ میرے والد کی طبیعت کا رجحان اس سے بعد مختلف تھا۔ میری والدہ کی طبیعت میں بدرجۂ اتم رحم تھا۔ وہ غریب لوگوں کے

ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ اور یہ اظہار ہمدردی اس قدر شدید اور مخلصانہ ہوا کرتا تھا کہ آنے جانے والوں پر اس کا گہرا اثر ہوتا تھا۔ فقیروں بھیک مانگنے والوں پر وہ اسقدر مہربان ہوا کرتی تھیں کہ ہم بہن بھائی ان کی اس قدر کمزور طبیعت پر ان سے بحث و تمحیص میں الجھ جایا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک پیر صاحب نے آکر سوال کیا:

"اے مائی! تیرا بیٹا گھر واپس آئے گا۔ بس سب سے اچھا کوٹ دیدے۔"

اور والدہ نے سب سے اچھا کوٹ اٹھا کر اسے دے دیا

بچوں سے جائز سختی ضرور کیا کرتی تھیں مگر مجھے کوئی ایسا وقت یاد نہیں جب والدہ نے ہم بہن بھائیوں کو ناجائز عمل کی ترغیب دی ہو۔ کسی کی غیر حاضری میں وہ کسی کے خلاف ایک حرف تک نہیں سن سکتی تھیں۔ ایک بہن بھائی سے دوسرے کے خلاف یا پڑوس والوں کے خلاف ان کی عدم موجودگی میں ایک حرف سننے کو تیار نہ ہوتی تھیں اور والدہ ہمیں ہمیشہ یہی سبق دیتی تھیں کہ کسی کے خلاف کچھ نہ کہو۔

ہم بہن بھائیوں میں ہنسی مذاق اور باہمی دل لگی بے تکلفی سے ہوتی تھی۔ دنیا کے سب لوگوں کو ہم جب اپنی جگہ بیٹھ کر ہدف تنقید بناتے اور سو سو نقص نکالتے تھے تو ہماری والدہ کو یہ بات بھی کسی طرح پسند نہ تھی انہوں نے ہمیں نوکروں کے ساتھ ہمدردی کرنا سکھائی۔ الغرض غریب پڑوسیوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک اس قسم کا تھا کہ والدہ کی موت پر سب لوگوں نے ماتم کیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئے، جیسے ان کی کوئی عزیز ترین متاع گم ہوگئی ہو۔

میری زندگی کو اگر کسی چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے تو وہ میری ماں کی گہری محبت تھی۔ میری ماں کی محبت جو میرے لئے ان کے دل

میں بھی اگر میں اس سے پوری طرح اور مکمل طور پر بہرہ مند نہ ہوتا تو میری دانست میں میری زندگی بے کیف بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ۔ میں نے اپنی ماں سے وہ تمام عادات حاصل کیں اور اپنے اندر ایسے ہی جذبات پیدا کر کے میں نے اپنی پرائیویٹ اور پبلک زندگی میں ہر لمحے انسانی ہمدردی اور خلوص سے استفادہ کیا۔ غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور دکھی پر رحم کھانا۔ یہ وہ جذبات ہیں جو میری روح میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ اور اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ یہ عادتیں میری زندگی کا کمزور پہلو ہیں ۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ میرے ان جذبات کے اظہار کو کمزوری پر محمول سمجھا گیا۔ کئی دوستوں نے میری توجہ اس پہلو کی جانب دلائی ۔ مگر میں اس فطرت سے پہلوتہی نہ کر سکا۔ نہ جانے کیوں ؟ جب ۱۹۴۷ء میں میں آزاد حکومت کا پہلی بار صدر چنا گیا تو اس دور میں جب کوئی غریب عورت میرے سامنے آتی تھی ۔ میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلتے ۔ فطری طور پر مجھ میں عورت کے ساتھ ایک گہری ہمدردی کا جذبہ موجزن رہا ہے۔ ہر عورت کو میں ایک مصیبت زدہ اور پس ماندہ مخلوق کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ کرتا رہا ہوں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے وطن میں خصوصاً سارے ایشیا میں عموماً عورتوں کے ساتھ بڑی سختیاں روا رکھی جاتی رہی ہیں۔ اور اب بھی بعض مقامات پر عورت کو ایک کھلونا سمجھا جاتا ہے۔ اور عورتوں سے ایسے ایسے کام لئے جاتے ہیں جو کسی صورت میں بھی وہ برداشت نہیں کر سکتیں ۔ میرے وطن میں ہر وہ کام جو سخت ہوتا یا جسے مرد کرنا پسند نہ کرتے اسے بلا جھجک عورت کے کندھوں پر ڈالا جاتا۔ آج تک مردوں کے دلوں میں عورت کے لئے وہ عزت نہیں ہے جو ایک بیٹے کے دل میں اپنی پیاری ماں کے لئے ہوتی ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے اسباب محض یہاں کے رہنے والوں کی اپنی کوئی خاص روایات

نہیں ۔ جو ایسی ذہنیت کی پیداوار ہیں بلکہ سارے ایشیا کی یہی ذہنیت رہی ہے کہ عورت کی واجب عزت انھیں کی جاتی اور اس کے مقابلہ میں مرد کی زیادہ سماجی حیثیت ہے ۔ سوسائٹی میں مرد زیادہ باوقار رہتا ہے اور رہنا چاہتا ہے ۔ اگرچہ مغرب کی تہذیب کے کچھ خفیف اثر نے اس ذہنیت میں تغیر کے آثار بیسویں صدی میں پیدا ضرور کئے جس سے موجودہ دور کی نئی تعلیم نے عورتوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ عورتیں تھوڑے ہی عرصے میں سوسائٹی میں اپنا صحیح مقام پیدا کرلیں گیں ۔

میرے والد کی طبیعت سخت تھی ۔ ان میں غصہ کرنے کی بڑی کمزوری تھی ۔ ہم سے بے حد پیار کرتے تھے اس میں بھی کلام نہیں مگر اس پیار کی اوٹ میں ان کے غصہ کا ہمیشہ ایک طوفان دکھائی دیتا رہتا تھا یہ ڈر رہتا تھا کہ نامعلوم یہ غصہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح کب پھوٹ پڑے ؟ کیونکہ ان کی اس حالت میں جبراً کنبہ کو تباہی دیکھنا پڑتی تھی ۔ ہم بہن بھائیوں میں سے اپنے والد سے کوئی بھی بے تکلف نہ تھا ۔ والد کا رعب سارے ماحول پر چھایا رہتا تھا ۔ جہاں وہ آرام کرتے ہوں وہاں سے ہم سب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے جاتے تھے ہمیں معلوم تھا کہ اگر ان کی نیند میں معمولی سا خلل بھی ہوا تو وہ سخت ناراض ہو جائیں گے اور ان کے غصے کی تاب لانے والا ہم میں سے کوئی بھی نہ تھا ۔ اس کے برعکس والدہ کی حلیم طبیعت کی وجہ سے ہم ان سے ہر راز کی بات کہہ سکتے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ ہماری والدہ ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈال سکتی تھیں ۔ ہماری کسی بھی کمزوری کو والد تک دیدہ دانستہ نہ پہنچاتی تھیں ۔ کیونکہ ان کو بھی احساس تھا کہ ہمارے والد غصہ میں آکر سب کے لئے مصیبت بن جاتے تھے ۔ بایں ہمہ سارے علاقہ میں ہمارے والد کا لوگ احترام کرتے تھے ۔ جہاں بھی کوئی باہمی تنازعہ ہو جاتا یعنی

تک میرے والد کو لوگ خوشی سے لے جاتے تھے تاکہ ان کے جھگڑوں کو نپٹا سکیں۔ والد ہمیشہ انصاف کی بات کرتے تھے۔ غریب کو امیر اور مظلوم کو جابر کے مقابلہ میں ترجیح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی حمایت میں ہر تکلیف کے لئے بھی تیار ہو جاتے تھے۔

چونکہ والد طبیعتاً خود بھی جابر واقع ہوئے تھے اس لئے کئی لوگ ان کے مخالف اور دشمن بن گئے۔ جن سے عمر بھر لڑائی ہوتی رہی۔ خصوصاً ہمارے گاؤں کے ہندوؤں سے ان کی ساری عمر مقدمہ بازی۔ فساد اور جھگڑا رہا۔ میرے والد ہندو کی شکل کو مکروہ سمجھتے تھے۔ ہندوؤں کو بلا جھجک منہ پر کہتے تھے کہ تمہاری شکل مکروہ ہے اور سہم حیران رہ جاتے تھے۔ بعض اوقات تو ہندوؤں سے بلا وجہ لڑائی مول لیتے تھے۔

میں نے اپنی والدہ کو ہندوؤں کے لئے بھی زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب انقلاب آیا تو گاؤں کے کچھ ہندوؤں کو میری والدہ نے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ خوشی سے گاؤں میں رہیں ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ ہوگی۔ ہمارے گاؤں میں ہی نہیں بلکہ سارے علاقہ میں ہندو اقلیت میں تھے۔ انہوں نے جب انقلاب اور طوفان کے آثار اُفقِ وطن پر ابھرتے ہوئے دیکھے تو ان کو اپنی زندگی کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ ہندو برہمن لوگ تھے۔ بڑے صاحب عزت اور صدیوں سے باوقار طریقہ سے اس ملک کے رہنے والے تھے۔ ڈوگرہ حکومت کی وجہ سے یہ اور بھی فخر سے چلتے تھے۔ ان سے شریف خاندان بھی تھے اور صاحب عزت بھی۔ مانا کہ ۱۹۴۷ء میں انہیں میں سے کئی لوگوں نے اس ملک کے پرامن ماحول کو تباہ کیا اور غلط رپورٹیں بھیج کر ڈوگرہ فوجوں کو اس علاقہ میں دعوت دی۔ چنانچہ ڈوگرہ فوجیوں اور حاکموں کی کم عقلی بیوقوفی اور ہٹ دھرمی سے ہی ریاست میں ایک انقلاب رونما ہوا جس

کا خمیازہ ان برہمن ہندوؤں کو سب سے زیادہ بھگتنا پڑا۔

پھر ایسا وقت آگیا کہ گاؤں میں مسلمان کے گھر ڈوگرہ فوجوں نے جلانے شروع کر دیئے۔ مقامی لوگوں نے مشتعل ہو کر ہندوؤں کے مکانوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ یہ برہمن لوگ جو گاؤں میں پر امن طریقہ سے آباد تھے جو میری والدہ پر بے حد بھروسہ کرتے تھے وہ میری والدہ کے پاس آگئے اور انہیں اپنا وعدہ یاد دلایا۔ میری والدہ نے ان کو پھر یقین دلایا مگر میری والدہ کو بدلے ہوئے حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ انقلاب بالآخر کس طوفان کی صورت اختیار کر جائے گا۔

چند دنوں میں حالات ایسے بدلے کہ انقلاب نے پوری ریاست کو آگ کے شعلوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر قسم کی سختیاں اور زیادتیاں عمل میں لائی گئیں۔ برہمنوں اور شاید ان کی عورتوں پر بھی سختیاں ہوئیں جب میری والدہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اس قدر پریشان ہوئیں کہ دنوں تک کھانا نہ کھا سکیں۔ زار زار روتی رہیں۔ جب دسمبر ۱۹۴۷ء میں میں اپنے گاؤں واپس گیا تو اس وقت میں صدر کی حیثیت سے علاقہ کا ذمہ دار تھا۔ میری پیاری والدہ نے ساری دردناک کہانی بیان کی۔ پھر اپنی پریشانی ظاہر کی کہ ان کا وعدہ اور یقین دہانیاں کس طرح روندی اور پامال کی گئیں۔ میں نے ان کے ساتھ بے حد ہمدردی کی اور بہت سمجھایا کہ انقلاب میں ایسا بھی ہوتا ہے اور انہیں ہندوستان میں ہونے والے فسادات کی تفصیلات بتائیں کہ کس طرح بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ مگر میری والدہ کو کوئی چیز تسلی نہ دے سکتی تھی اور یہی کہتی رہیں کہ روزِ قیامت میں کیا جواب دوں گی! میں نے ان کو سمجھایا کہ جس معاملہ میں آپ کا اختیار ہی نہ تھا اس کے متعلق فکر اور تشویش کرنا بے سود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مرتے دم تک میری پیاری

والدہ کو یہ خیال ضرور ستاتا رہا کہ روزِ قیامت یہ سوال ضرور ان سے پوچھا ہی جائے گا۔

میری والدہ کا اللہ پر یقین اور اللہ کے قوانین پر یقین سمندر کی گہرائی کی طرح گہرا تھا۔ ان کے اس یقین کو کوئی چیز متزلزل نہ کرتی تھی۔ جب میرے والد کی وفات ہوئی میں اس وقت ولایت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور جب میری والدہ کی وفات ۱۹۵۳ء میں ہوئی تو میں اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا اور جب میں پھر وہاں جاکر ان کی لحد پر گر پڑا تو بے قراری اور بے صبری کے عالم میں ایک بچے کی مانند اتنا رویا کہ میری ہچکی بند ہو گئی ۔۔۔۔ مجھے احساس ہے کہ میں زندگی بھر اتنا نہیں رویا اور ایسی بے قراری اور مایوسی کی کیفیت کسی اور واقعہ نے پیدا نہ کی تھی۔

ابتدائی تعلیم

میں چھوٹی عمر ہی میں اپنے گھر کے معمولی کام کاج کرتا رہا۔ یہ کسی کے ذہن میں بات نہ تھی کہ میری تعلیم کی طرف کوئی خصوصی توجہ دی جائے گی۔ نہ ہی اپنے خاندان میں مجھے خاص حیثیت حاصل تھی۔ آٹھ بہن بھائیوں میں میں ایک تھا۔ بلکہ گاؤں کے اور بچے جب سکول جانے لگے تو مجھے سکول میں بھیجنے کے متعلق کسی کے ذہن میں کوئی خاص خیال نہ تھا۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی صاحب کا بڑا بچہ بھی سکول کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ مگر میرے سکول جانے کی تجویز ابھی زیرِ غور ہی نہیں تھی۔ ہمارے والد

ان دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں عموماً باہر رہا کرتے تھے۔ کئی ہفتوں بلکہ مہینوں تک ہمیں ان کی خبر ہی نہ رہا کرتی تھی۔ پھر مہینوں کے بعد وہ آتے تو اپنے ساتھ ہر ایک چیز لاتے جن میں بچوں کے لئے نئی قسم کی مٹھائیاں بھی ہوتیں اور اس طرح ہمیں اپنے والد کی آمد کا صحیح احساس ہوتا۔

گھر میں ہم سب نے اپنے بڑے بھائی صاحب سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی جو محض عربی کا قاعدہ پڑھ کر قرآن کی عبارت پڑھنے کا سلسلہ ہوتا ہے مگر اس تعلیم میں نہ تو اتنی کامیابی ہوئی نہ اس میں کوئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ البتہ ہر صبح کی مار پٹائی ابھی تک یاد ہے۔ اس وقت یہ قصہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کام کی منز ل کیا ہے؟ لیکن یہ سوال کرنا بھی تو بغاوت اور گناہِ عظیم کے مترادف تھا۔ اس وجہ سے بڑے بھائی صاحب کا ہم پر رعب تھا اور رہا۔ ہم ان کو والد کا مقام دیتے تھے۔ اس لئے بھی کہ والد کی عدم موجودگی میں حکم انہیں کا چلتا تھا اور والدہ ان کے ہر حکم کی تصدیق بلا جھجک کرتی تھیں۔ لامحالہ یہ مقام ہمارے لئے قابل تھا۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ صرف میں نے (باقی جو میری بہنیں تھیں ان میں اتنی جرأت کہاں تھی) بھائی صاحب کے حکم کے خلاف علم بغاوت کیا۔ اس وقت میری عمر دس بارہ سال کی تھی۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ میں ان کے حکم کو ٹھکرانے کے بعد بھاگ پڑا اور چڑھائی کی جانب چلا ——— بھائی صاحب نے (جو بدن میں ہم سب سے بھاری ہیں اور ان کی ایک ٹانگ بھی کمزور ہے) کا پیر التعاقب شروع کیا۔ بہر حال کافی مسافت طے کرنے کے بعد میں ایک پہاڑی کی اوٹ میں اس لئے بیٹھ گیا آخر یہاں تک ان کا پہنچنا محال ہے اور اپنے آپ کو وہاں خطرے سے باہر سمجھ کر بیٹھا سوچنے لگا۔ خطرہ بہر حال ایسا تھا جس کے مقابلے کی تاب بھی موجود نہ تھی۔ میں اسی معاملہ پر سوچ بچار میں تھا کہ اب کس جگہ کی طرف رجوع کریں کہ بھائی

صاحب میرے سر پر آدھمکے۔ انہوں نے مجھے کچھ نہ کہا اور میں بھی ان کے ساتھ اٹھ کر چپ چاپ چل پڑا۔

ہمارے بڑے بھائی صاحب پر والدہ کا اثر موجود ہے۔ وہ بڑے رحم دل واقع ہوئے ہیں۔ میری والدہ کو ان سے ایک خصوصی الفت تھی۔ شاید بچپن کے دنوں کی یاد تھے کہ جب وہ پیدا ہوئے تھے، صرف وہی تھے ہم سات نہ تھے۔ یا میری والدہ کو یہ خیال رہتا تھا کہ ان میں (بھائی صاحب میں) کچھ جسمانی کمزوریاں تھیں جو وہ اپنی شفقت خصوصی سے پورا کرنا چاہتی تھیں۔

میں نے جب پرائمری سکول میں داخلہ لیا تو میری عمر کافی ہو چکی تھی یعنی دس بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس سکول میں میرے بڑے بھائی صاحب ہی پڑھایا کرتے تھے۔ میں انہی کے ساتھ صبح جاتا اور شام کو واپس آتا۔ سکول ہمارے گھر سے دور تھا یہ کم و بیش چار میل کا سفر تھا۔ اپنے سکول جانے کا خیال مجھے خود آیا۔ یا یہ تحریک میرے والد کی تھی۔ اب مجھے یہ صحیح یاد نہیں ہے البتہ یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سکول میں جانے کا شوق مجھے بے حد تھا۔ شاید گھر کے کام کاج سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ یا طبیعت ایک نئی دنیا کی تلاش میں تھی یا پھر گاؤں کے دوسرے بچوں کا رشک تھا۔ جب میں سکول میں داخل ہوا تو مجھ میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ میں اس نئے ماحول سے متاثر ہوا۔ سکول کے ماحول نے مجھ پر ایک رومانی کیفیت طاری کر دی۔ یہ جنون محض آوارہ گردی یا سکول میں ہمجولیوں سے کھیل کود کا نہ تھا بلکہ میری طبیعت میں ایک چڑھاؤ پیدا ہو رہا تھا اور ایک دبا ہوا جذبہ یک دم اظہار کا متمنی تھا۔

میری ابتدائی تعلیم بھی طبیعت کے چڑھاؤ کی طرح ہوئی۔ میں نے اردو کا قاعدہ چند دنوں میں ہی ختم کر لیا۔ پھر دوسری جماعت کی کتابیں باقی طالبعلموں

سے مانگ کر پڑھ ڈالیں۔ حساب کے سوال ایک سال کے اندر تیسری چوتھی جماعتوں کے یکجا حل کر ڈالے۔ میرے استاد بہت خوش ہوئے اور حیران بھی کہ یہ طالب علم کس تیزی سے پڑھ رہا ہے۔ ہیں سارے گاؤں میں فخریہ پیش کیا گیا اور سکولوں کے انسپکٹر کو دکھایا گیا۔

یہی نہیں بلکہ جب میں چہارم جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے استاد سارا سکول میرے حوالے کر کے اطمینان کے ساتھ جہاں چاہتے چلے جاتے تھے۔ گھر سے دیر میں آئیں تو ان کو اطمینان تھا کہ سکول اپنی جگہ پر باقاعدگی سے کام کر رہا ہے۔ تمام سکول کے طلباء (جن کی تعداد دو یا ڈھائی سو ہوگی) مجھ سے خوش تھے اگرچہ میں ناجائز سختی کا بھی بسا اوقات مرتکب ہو جاتا تھا اپنے جسم میں سب سے دبلا سکول میں میں ہی تھا مگر سخت ذہین ہونے کی وجہ سے تمام طالب علم میرا احترام کرتے تھے۔ اس ماحول نے مجھ میں ایک عجیب خود اعتمادی پیدا کی اور ذمہ داری سنبھالنے کا ایک ایسا جذبہ پیدا کیا کہ میں نے اپنے آپ میں ضبط و نظم پیدا کیا۔ سارے عرصے میں صرف ایک دفعہ مار کھائی وہ اس لئے کہ ایک ندی میں بلا اجازت ہم لوگ نہاتے رہے تھے جو کہ خطرناک معاملہ تھا۔ ہم لوگ ندی میں نہایا ضرور کرتے تھے مگر استاد صاحب کی موجودگی میں چونکہ مار خاصی پڑی تھی اس لئے اب تک یاد ہے۔

میری ساری پرائمری تعلیم تین ہی سال میں مکمل ہو گئی جبکہ باقی طلباء اس کورس کو پانچ برس میں مکمل کرتے تھے۔ سکول میں چار میل پیدل آنا جانا کار سے دارد والا معاملہ تھا۔ اگر کوئی تکلیف اس دور کی مجھے یاد ہے تو یہی طویل مسافت آج جب میرے بچے سکول جاتے تھے جن کے سکول کا فاصلہ آدھ میل سے زیادہ نہ ہوگا تو اس وقت کو یاد کرتا ہوں۔ میں نے اپنے

بیٹے فاروق کو (جس کی عمر ۹ سال کے لگ بھگ ہے) سکول پیدل جانے کو کہا تو چند دن تک وہ جاتا رہا پھر ایک دن کہنے لگا "یہ دو موٹریں آخر کس لیے رکھی ہیں۔ وہ بڑے غصے میں تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور میں نے لے سمجھایا کہ دیکھو بیٹا! میں چار میل پیدل جایا کرتا تھا، جب جوتی پھٹ جاتی تھی تو بغیر جوتی کے بھی چلا جاتا تھا۔

مگر وہ اُسی انداز سے کہنے لگا "آپ کے والد صدر تھوڑے ہی تھے۔"

اس کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میں نے سوچا کہ میرے والد مجھ سے کتنے بلند تھے اور ان کی آنکھ کتنی دوررس تھی۔ ان کی جدوجہد کس قدر محنت طلب تھی۔ مجھے جو تعلیم دلائی گئی کاش میں بھی اپنے سب بچوں کو دلا سکوں! جو زندگی مجھے نصیب ہوئی تھی اس سے میرے بچے آشنا نہیں ہوئے اور نہ ہوں گے میری زندگی سخت محنت اور استقلال کی زندگی تھی۔ میری اوائل زندگی کا ماحول عجیب تھا۔ میری اپنی کاوش اور غیر متزلزل ارادوں نے مجھے بلندی تک پہنچایا تھا مگر اس بلندی سے میرا مطلب کسی منصب کی بلندی نہیں۔ اس سے میرا مطلب میرے ذہن کی بلندی ہے جو مجھے صحیح تعلیم سے حاصل ہوئی۔

کاش کہ میرے بچوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ ہمت اور استقلال نصیب ہو جس سے میری زندگی آشنا ہے۔

میں نے پرائمری جماعت کا امتحان بڑے شوق سے دیا تو تمام مرکز (جس میں کم و بیش بیس سکولوں نے شمولیت کی تھی) میں میں اول آیا۔

حکومت کی جانب سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور دو روپے وظیفہ دیا گیا۔ پرائمری کے بعد تعلیم کا سلسلہ ایک بڑا جان جوکھوں کا کام تھا ایسا تھا کہ کسی کو بچوں کو تعلیم دلانے کا نہ شوق تھا اور نہ ہی کوئی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ پھر ہائی سکول جانے کے لئے کافی متمول ہونے کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ بات بہت کم لوگوں کے ذہن میں آتی تھی کہ پرائمری کے بعد بھی تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کے نزدیک پرائمری کی تعلیم ہی کافی تھی۔ اس کے بعد بچہ فوج میں جائے گا۔ نوکری کرے گا۔ ماں باپ کو کھلائے گا۔ یہی زندگی کا منتہائے نظر تھا۔

میرے والد ان تمام لوگوں سے بڑھ کر سوچتے تھے کیونکہ ان کا تعلق باہر کی دنیا سے بھی تھا۔ حکومت کے اہل کاروں سے اٹھنا بیٹھنا تھا۔ شاید ان کے دل میں یہ خواہش بھی ہو گی کہ بیٹا پڑھ کر ممکن ہے افسر ہی بن جائے یہ وہ دور تھا جب کہ ریاست کشمیر میں تھانیدار کے سوا کوئی مسلمان افسر نہ ہوتا تھا کسی مسلمان کے تصور میں یہ بات آسانی سے آتی ہی نہیں تھی کہ ہندو حکومت کے زیر سایہ کسی مسلمان کو کوئی نوکری مل سکتی ہے۔ خدا جانے میرے والد کو کس تصور نے اکسایا بہر حال انہوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ مجھے ہائی سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ والدہ نے اس تجویز کی بڑی زور سے مخالفت کی اور کہا کہ اب یہ صرف دینی تعلیم پڑھے گا۔ قرآن اور اسلام کی کتابیں ہی اسے پڑھنا چاہئیں اور بس پھر یہ ہائی سکول بھی ہمارے گھر سے ۱۴ میل دور تھا اور میری ماں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ یہ بچہ اپنی ماں سے الگ ہو کر شہر کی گلیوں میں آوارہ و پریشان دھکے نہ کھائے۔

والدہ کی رائے محض رائے ہی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ فیصلہ ہوتا تھا مگر والد

میں ڈکٹیٹر کی پوری صفات موجود تھیں۔ رائے لینے کے لئے تو سب سے پوچھ لیتے تھے مگر کرتے وہی تھے جس کا ارادہ وہ پہلے سے قائم کر چکے ہوتے تھے اور اس ارادے کو تبدیل کرانے کے لئے ان کو کافی یقین دلانے کی ضرورت پڑتی تھی بالآخر میں نے نومبر کے مہینے کی کسی تاریخ کو اپنی والدہ اور باقی بہن بھائیوں کو الوداع کہا اور ایک ان دیکھی دنیا میں قدم رکھا۔ راستے میں علاقے کے تھانہ دار صاحب ملے تو انھوں نے میرے والد سے پوچھا کہ بچے کو کہاں لے جا رہے ہو میرے والد نے جب سکول کی بات کہی تو حیران ہوا۔ اسے اچنبھا تھا کہ اب یہ لوگ ہائی سکول تک کی باتیں سوچنے لگے۔ مجھے آج تک اس تھانہ دار کا ہلتا ہوا سر یاد ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جب یہ بات اس نے سنی تو مرغ کی طرح اس کی آنکھیں کسی سوچ میں پڑ گئیں۔

میرے والد نے مجھے ایک اور صاحب کے سپرد کیا۔ داخلے کے لئے اس کے حوالے کچھ پیسے بھی کئے۔ دن ڈھل چکا تھا۔ ہمارے ساتھ اور بھی ساتھی ہو گئے۔ ان ساتھیوں نے باہمی فیصلہ کیا کہ رات بھر سفر کیا جائے ان ظالم لوگوں نے ایک پہاڑی نالے کا راستہ پکڑا جہاں سوائے پتھروں کے کچھ نہ تھا۔ اندھیری رات تھی۔ پہاڑ کے لوگ بڑے سخت جان ہوتے تھے۔ ۲۵، ۳۰ میل کے سفر کے بعد ہم لوگ صبح دوسرے دن شہر پونچھ میں داخل ہوئے میں چور چور ہو چکا تھا۔ پونچھ شہر کا پرانا قلعہ مجھے دکھائی دیا تو میں نے یہ سمجھا کہ اس کی چھت آسمان کو چھو رہی ہے۔ ایسی کوئی عمارت میرے تصور میں نہ تھی۔ سپاہی کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی بڑی عمارت کو یہ دو تین سپاہی کس طرح سنبھال سکتے

ہوں گے!

مجھے انہی لوگوں کے ساتھ رہنا پڑا کیونکہ میرے لئے کوئی مستقل انتظام میرے والد کے آنے پر ہی ہو سکتا تھا۔ شہر پونچھ والوں کی زبان ذرا ہماری پہاڑی زبان سے مختلف تھی۔ پونچھ کے علاقہ سدھنوتی کی زبان مری والوں کی زبان سے زیادہ ملتی ہے۔ شہر پونچھ میں یا کشمیری زبان بولتے تھے (جو میرے بڑے لاطینی سے ایک قدم آگے تھی) یا پنجابی بولتے تھے مجھے نہ پنجابی آتی تھی اور نہ کشمیری۔ جب میں اپنی پہاڑی میں بولتا تھا تو دوسرے لڑکے میرا مذاق اڑاتے تھے۔ زیادہ عرصہ خاموش رہنا پڑتا تھا۔ طبیعت اتنی حساس تھی کہ ذرا بھر بات برداشت بھی نہ ہو سکتی تھی۔ کچھ دن تو صبر سے کام لیا گیا پھر شہر کے گستاخ لڑکوں سے ٹھن گئی تو میں نے اپنا ہاتھ کھلا استعمال کیا۔ جب دو تین کو بے تحاشا پڑ گئیں تو وہ سب مجھ سے ڈرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد زبان بھی آ گئی اور رعب بھی اپنی جگہ قائم ہو گیا۔

والد کے آنے پر مجھے اپنے ایک استاد کے یہاں ٹھہرایا گیا۔ استاد بڑے مہربان تھے۔ ان کے گھر والے اور بھی مہربان تھے۔ مجھے ان کی مہربانیاں آج تک یاد ہیں۔ ابتدا میں کچھ حجاب رہا مگر بعد میں خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ ان کے ہاں کچھ ایسے بچے تھے جن کے ساتھ مل کر میں نے شہر کے بچوں کی خامیاں تو اپنے میں قبول کر لیں مگر خوبی کوئی قبول نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دن بھر کھیل کود میں گزرتا۔ پڑھائی کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی۔ میں ذہانت میں سکول میں کسی بچے سے کم نہ تھا مگر محنت مجھ سے مفقود ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکول میں ہائی بچوں سے پیچھے رہ گیا۔ استادوں کی جھاڑیں بھی کھانا پڑتی تھیں۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ میرے استاد کے گھر میں ایک گھر کا اچھا ماحول تو تھا مگر طالب علم

کے لئے اچھا ماحول نہ تھا۔ تنہائی کبھی نصیب ہو ہی نہیں سکتی تھی، نہ ہی الگ ایسی جگہ تھی جہاں اور پڑھ سکیں۔ ان میں سے کئی ایسے بھی تھے جو پڑھائی کے نام سے کانپتے تھے۔ میں نے انجام کار یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے یا تو بورڈنگ ہاؤس میں چلا جانا چاہیے یا واپس گھر چلا جانا چاہیے۔

بورڈنگ ہاؤس میں

میں نے اپنے والد کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ مجھے بورڈنگ ہاؤس میں چلا جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ لے لیا۔ مگر مجھ سے حماقت یہ ہوئی کہ میں نے اپنے استاد سے مشورہ نہ لیا نہ ہی گھر والوں سے اجازت لی۔ گھر والے قدرتاً مجھ سے خفا ہو گئے اور مجھے معاف نہ کیا۔ اس کی سزا مجھے بعد میں کئی طریقوں سے بھگتنا پڑی۔ کیونکہ سکول کے ہیڈ ماسٹر ان کے نزدیک کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ ان ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرا میٹرک کرنے تک ناک میں اس طرح دم کیا کہ اس کی یاد سے آج بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بورڈنگ ہاؤس میں اپنے علاقہ کے کئی دوست ملے۔ ان میں محمد حبیب خاں بھی ہیں (جو آج کل پاکستان فارسٹ سروس میں چیف کنزرویٹر ہیں) ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ چھٹیوں میں گھر آنا اور پھر واپس جانا ساتھی کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ حبیب خاں کی طبیعت اور میری طبیعت میں بے حد تضاد تھا۔ میری طبیعت میں شرارت اور جابرانہ رجحان تھا۔ مگر

حبیب خان میں شرارت کم تھی اور جابرانہ مزاج بہت ہی کم بلکہ بالکل نہ تھا۔ حبیب خان مجھ سے یقیناً زیادہ ذہین نہ تھے لیکن ہم سب سے زیادہ محنتی اور کم گو تھے۔ میرے ہم مزاج ایک اور صاحب تھے جن کا نام اکبر ہے۔ وہ آج کل آزاد کشمیر پولیس سروس میں ہیں۔ ہم نے اپنا ایک گروہ بنا لیا اور اپنے گروہ کی حمایت جزو ایمان بن گئی تھی۔ دوسرے پر محض ایک دوسرے کا اشارہ پاکر حملہ کر دیا جاتا مگر اتنی عقل ضرور تھی کہ اپنے سے بڑے طالب علموں کے ساتھ دوستانہ رسم و راہ رکھی جاتی تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔ ہندو لڑکے ہم سے کانپتے تھے۔ اگر سکول میں استاد کی وجہ سے ہم معاف کر دیتے تھے تو کھیل کے میدان میں ہماری طاقت کو کسی جانب سے چیلنج کا خدشہ نہ تھا۔ میری اسی سخت طبیعت کی وجہ سے کئی استادوں سے بھی لڑائی ہوئی۔ مولوی نذیر احمد صاحب ہمارے اردو اور فارسی کے بڑے بارعب اور دبدبہ والے استاد تھے۔ وہ دینیات کے مولوی کی طرح نہیں تھے بلکہ عینک پہن کر وہ خود ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے کلاس میں داخل ہوتے تھے۔ ان سے میری کئی بار جھپٹ ہوئی۔ ایک بار جب سکول کو کھیل کے لئے چھٹی ہوئی تو تمام سکول کھیل کے میدان میں پہنچا۔ وہاں میری اور میرے محترم استاد کی ٹکر کسی معاملے میں ہوئی اور لڑائی تک نوبت پہنچی۔ مولوی صاحب نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے ہی مہربان تھے لہذا مجھے خود از راہ کرم مولوی صاحب نے معاف کر دیا مگر ان میں یہ بات تھی کہ گو وہ مجھے ڈانٹتے تھے مگر دل میں میری دلیری اور جرأت کا سکہ مان چکے تھے۔ یا اس جرأت کی داد دینے پر مجبور ہوئے تھے۔ خود مولوی صاحب بڑے بارعب تھے اور انہیں چیلنج کرنے کی جرأت کے لئے دل گردہ کی ضرورت تھی مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں سکول میں کافی سینئر

ہو چکا تھا اور غالباً نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم بن چکا تھا۔

بورڈنگ ہاؤس کے داخلے کے بعد میرے محترم ہیڈ ماسٹر صاحب (جو بورڈنگ ہاؤس کے بھی سپریم کمانڈر ہوا کرتے تھے) نے مجھ پر کافی سختی کی خدا انہیں وہ سب بخش دے۔ وہ طبیعتاً خاصے کینہ پرور واقع ہوئے تھے یا انہیں یہاں تک آمادہ کیا گیا تھا کہ اگر مجھ سے ذرا بھر بھی بھول جائے تو مجھے فوراً سکول سے ہی خارج کر دیا جائے۔ تاہم میرے ہمدرد استادوں کی بھی کمی نہ تھی۔ کھیل کے میدان میں بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتا تھا۔ کھیل میں اکبر میرا ساتھی تھا۔ جیب کھیل میں جاتے ہی زیادہ نہ تھے اور ایک دفعہ جب ہاکی کھیلتے ہوئے جیب کا دانت ٹوٹ گیا تو پھر وہ اور بھی محتاط ہو گئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب ویسے بھی طبیعت کے سخت واقع ہوئے تھے۔ ان میں ہنسی مذاق یا دل لگی والی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے ہنستی ہوئی شکل ان کی کبھی نہ دیکھی تھی۔ غالباً ازل سے نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔

ایک دفعہ شامت اعمال سے ہم لوگ اسلامیہ ہائی سکول میں ہاکی کھیلنے چلے گئے ظاہر ہے کہ استادوں کو خبر نہ دی۔ اجازت ملنا ہی محال تھی اسلامیہ ہائی سکول سے محترم ہیڈ ماسٹر صاحب کو خاصی چڑ تھی۔ دوسرے دن ہماری شکایت ہیڈ ماسٹر تک پہنچ گئی نہ معلوم کس طرح اگر مجھے یاد ہے کہ ہم کو بیس بیس بید ہاتھوں پر لگائے گئے پھر بھی ہم کھڑے رہے۔ میں اکیلا ہی ہوتا تو خدا جانے کیا سزا ملتی۔ میری وجہ سے ہی بیس بیس بید باقیوں کو بھی کھانے پڑے ورنہ ان سے شاید وہ نرمی برتنے کے لئے تیار ہو جاتے۔

سکول کی یادیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میری فیس دیر سے داخل ہوئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے تین ماہ کے لئے بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا۔ اس وقت میں آٹھویں میں تھا اور اپنے آپ کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ اسی سال پھر کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ مجھے مجبوراً سکول سے بھاگنا پڑا۔ چھٹیوں سے پہلے ہی میں اپنے گھر واپس چلا آیا۔ اب کی مجھے یقین تھا کہ محترم ہیڈ ماسٹر صاحب کسی صورت میں مجھے سکول میں قدم نہیں رکھنے دیں گے اور میں تو گاؤں گیا ہی اس ارادے سے تھا کہ اب سکول آنے کا ہی نہیں بلکہ یہ خبط سوار تھا کہ اب فوج میں بھرتی ہو جائیں گے۔ میرے گاؤں کا اور میرے خاندان کا ایک ایک جوان فوج میں تھا۔ جب یہ لوگ فوج سے واپس آتے تھے اور پریڈ کرتے تھے۔ تو میرے دل و دماغ پر فوج میں جانے کا بھوت سوار رہتا تھا۔ مجھے سپاہیوں کی کہانی سن سن کر فوج کے نظم و نسق سے دلچسپی ہونے لگی۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر پریڈ سیکھنی شروع کی اور "سلوٹ" کرنا بھی سیکھ لیا۔ اپنے آپ میں وہ اکڑ پن پیدا کرنا شروع کیا جو سپاہی کیلئے ضروری ہے۔

یہ میری زندگی کا عجیب موڑ تھا۔ میں نے گھر آکر پھر سوچا۔ میرے والد مجھ سے اس قدر خفا ہوئے کہ مجھے وہ کوفت آج تک یاد ہے لہذا میں نے چپکے سے جا کر جیب سے چھٹیوں کا کام لے لیا (جو کہ میرے ہم جماعت تھے) درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر چھٹیوں کا کام میں نے آہستہ آہستہ ختم کیا۔ اس فیصلے پر مجھے ایک اور واقعہ نے آمادہ کیا۔ میرے ایک دوسرے

استاد نے میرے لئے یہ پیغام بھیجا کہ اگر میں سکول میں واپس آجاؤں تو مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔ استاد نے پوری ذمہ داری لی تھی اس لئے میں نے اپنا ارادہ سپاہی بننے کا ترک کر دیا۔ اگرچہ ساری عمر فوجی معاملوں سے مجھے دلچسپی رہی کیونکہ سارا علاقہ اور گاؤں کا سارا ماحول سپاہیانہ تھا۔

چھٹیوں کے اختتام پر میں چپکے سے سکول واپس چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو غالباً بات ہی یاد نہ رہی لہذا کوئی طوفان پیدا ہوا نہ ہی کوئی میدان کارزار بنا اس سانحہ کے بعد سکول میں میری زندگی باقاعدہ ہو گئی۔ اور میں نے اپنی پڑھائی کی جانب زیادہ توجہ دینی شروع کی ایک ایسا احساس پیدا ہوا جس نے میرے نکتہ نظر کو ہی بدل دیا۔ ایک الھڑ زندگی سے بدل کر میری زندگی معتدل ہو گئی۔ اس زمانہ میں میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہو گی۔

شباب کی انگڑائیاں

یہاں سے میری زندگی کا تعمیری دور شروع ہوا۔ اور یہ احساس آج مجھے ہوتا ہے۔ ورنہ اس وقت یہ وہم و گمان کس کو تھا کہ زندگی دریا کی طرح ایک نیا موڑ کاٹ رہی ہے۔ فارسی کی شاعری اور اردو کے شعر جس طرح سے اب مولوی نذیر احمد سمجھانے لگے اس کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ داڑھی کے بال اگنے لگے تھے اور جوانی مجھ میں عجیب انداز سے انگڑائیاں لینے لگی۔ بہار کی آمد پر باغوں کی سیر سے طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوتا تھا۔ پونچھ شہر کے قریب بے نظیر باغات تھے۔ ان کی سیر اور پھر بہار کے سورج کی چڑھتی ہوئی دھوپ طبیعت میں ابال پیدا کرتی

تھیں۔ پونچھ شہر کے ان بے نظیر باغات میں گلاب کے بہترین پھول دیکھنے میں آتے ہیں۔

اقبالؒ کے شعروں کے معنی بھی اب سمجھ میں آنے لگے تھے اور ان کے مطلب بھی پڑھنے میں عجیب رسیلا پن محسوس ہوتا تھا۔ کانگریس کی تحریک اور پھر انقلاب کی باتیں بھگت سنگھ وغیرہ کے متعلق گیت یہ ایسا ماحول تھا جسے طبیعت قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب خود ان چیزوں سے دل چسپی رکھتے تھے۔ گو کہ ریاست میں میدان گرم نہ تھا۔ ہندوستان کی اخباریں پڑھ کر ہم سب نیشنلزم کا اثر قبول کرتے تھے۔ یہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے زمانہ کی باتیں ہیں۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں ریاست کشمیر میں ایک انقلاب آیا۔ اس کی ابتدا کس طرح ہوئی، اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں بس صرف یہی یاد ہے کہ ہندو لوگ اپنے گاؤں چھوڑ کر شہر میں آ گھسے۔ شہر میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ ہندو بچوں اور عورتوں کو ہم نے عجب حالت میں دیکھا۔ ہمارے سکول کی ساری عمارت ان مہاجرین کے حوالے کر دی گئی۔ مسلمان کسی خطرہ میں نہ تھے۔ ہمارے راجہ صاحب اور وزیر صاحب سارے قلعہ میں گھس گئے اور ہم سکول کے مسلمان بچوں نے سارے شہر کا پہرہ دیا۔ ہم میں اتنی جرأت پیدا ہوئی کہ ہم اپنے "سپہ سالار" ہونے پر خود حیران ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ مسلمان لڑکوں میں اس وقت میری حیثیت بڑے سینئر کی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔

مہذب وحشی

پونچھ کے اس سیاسی انقلاب نے یہ صورت اختیار کی کہ سری نگر سے فوجیں نازل ہونے لگیں۔ ان فوجوں کے کمانڈر ایک انگریز "صاحب" گھوڑے پر

برآمد ہوئے ہم بھی اسے دیکھنے گئے۔ یہ صاحب سخت مزاج اور کرخت لہجہ میں گھوڑے پر ہی لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ہمارے ایک سکول ماسٹر صاحب جنہیں اپنی انگریزی بولنے پر بے حد ناز تھا۔ آگے بڑھ کر جواب دینے لگے۔ صاحب نے چابک گھما کر ہوا کو اس طرح چیرا کہ ہمارے محترم استاد کو انگریزی کی ساری بات بھول گئی۔ طالب علموں میں ان کی بڑی کرکری ہوئی۔ پونچھ کی سرزمین میں یہ ایک انقلابی دور تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب میں ولایت گیا (جب میں سلامتی کونسل میں شمولیت کیلئے امریکہ جا رہا تھا) تو یہ جارڈین صاحب مجھے "مارل ری آرمامنٹ" کی تحریک کے راہنما کی حیثیت سے بڑے پرتپاک طریق سے ملے۔ میرے تصور میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ وہی جارڈین صاحب ہے جس نے چابک ہوا میں گھمایا تھا۔ وہاں وہ دیو کی شکل بن کر جابر کی حیثیت سے آیا تھا اور یہاں ولایت آکر کس قدر مہذب ہو گیا تھا۔

ریاست پونچھ میں اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں سے صدیوں کے بدلے لئے۔ یہ ہندو لوگ دراصل وہاں کے نہ تھے۔ باہر سے آئے ہوئے کھتری لوگ تھے۔ ان لوگوں نے سود خوری کے ذریعے غریب زمینداروں کی غربت اور افلاس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ دراصل وہاں کے رہنے والے جو ہندو لوگ تھے تو وہ چند شریف سے برہمن لوگ تھے۔ یہ کھتری قسم کے ہندو پنجاب سے جاکر وہاں کھلی تجارت کر رہے تھے۔ معمولی نسوار کی بوری سے کاروبار شروع کر کے لاکھوں کے مالک ہو گئے تھے۔ سود در سود وصول کر کے انہوں نے وہاں کے زمینداروں کا خون چوس لیا تھا۔ صاحبِ زمین کی حیثیت ہی نہ رہی تھی۔ زمیندار کی زمین اور ان کی عورتوں تک رہن ہو چکی تھیں۔ کھتری کا راج تھا۔ مقامی حکومت ہر طرح اس کھتری کی حمایت کرتی تھی۔ ساری ریاست کشمیر میں اس کھتری نے ایسے جال پھیلائے تھے کہ صاحب زر بھی کھتری تھے وکیل بھی کھتری تھے۔ ڈاکٹر بھی استاد بھی اور حکومت کے معمولی سے لے کر بڑے ملازم تک

سب کھتری تھے۔ ساری ریاست کا اقتصادی نظام ان کھتریوں کے جابر اور ظالم ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ ان سے مخلصی کی کوئی صورت صدیوں تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مسلمان اور دوسرے ہندو لوگ بھی اقتصادی طور پر بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

ریاست کشمیر میں انجام کار سیاسی تحریک کو ایک انقلاب کی صورت جس نے دی تھی اس کا پس منظر یہی اقتصادی غلامی تھا اور یہ بلاتردید کہا جا سکتا ہے کہ ان ہندو لوگوں کو مسلمانوں سے کوئی ہمدردی ہی نہ تھی۔ مسلمانوں کی چمڑی پر بھی سونے کیلئے تیار رہتے تھے۔ جب خون کا کوئی رشتہ نہ ہو۔ مذہب کا رشتہ بھی چھوٹا ہی فساد ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو مسلم عوام سے کیا ہمدردی ہو سکتی۔ ادھر مسلم عوام کی اقتصادی بدحالی کیساتھ ساتھ ان کی سوشل اور تعلیمی حالت اس قدر پس ماندہ تھی کہ جس کی تفصیل کوئی بیان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے جاتے تھے اور ان سے ہر کام لیا جاتا تھا۔ وادی کشمیر میں ابھی تک "بے گار" کا رواج تھا پونچھ میں ابھی تک گاہے گاہے گوجر قبیلہ کے غریب لوگوں پر بے گار کی مکروہ رسم کا اطلاق ہوتا تھا۔ ساری ریاست میں اگر کوئی قبیلہ من حیثیتِ قبیلہ بہت بری طرح اس استبداد اور جبر کی چکی میں پسا تھا۔ وہ گوجر قبیلہ تھا ان میں تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی حد درجہ تھی۔ ان کی صحیح نمائندگی کرنے والا کوئی جرأت مند لیڈر بھی نہ تھا۔ اب آہستہ آہستہ مسلم کانفرنس نے ان کی خفیف سی حمایت شروع کر دی تھی حکومت جس کو چاہے "کار سرکار" پر بغیر مزدوری دیے لیجاتی تھی۔ یہ رسم بے گار کہلاتی تھی۔ اور جب غریب لوگ بغیر مزدوری کے دور دور بیگار کیلئے جاتے تھے تو ان کے گھر والوں کو کوئی خبر نہ ہوتی تھی کہ وہ کہاں لیجائے گئے ہیں۔ ان پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ زندہ ہیں کہ مر گئے! کیا زندگی میں ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ یہ بیگار کا حکم مرگِ مفاجات سے کسی قدر کم نہ تھا پھر تھانے دار کی بیگار تو چوبیس گھنٹے رہتی تھی پولیس بھی اس دور کی جابر اور راشی تھی۔ تھانے دار انسانوں کی چمڑی پر بلا جھجک سوتا تھا۔ کوئی پرسان حال ہوتا ہی نہ تھا۔ ظلم کے خلاف کوئی آواز اٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ تھانے دار کے علاوہ اور کئی

وہاں بھی تھے۔ ان میں تحصیل دار الگ تھا۔ نائب تحصیلدار کا ڈیرہ الگ تھا۔ پھر پٹواری صاحب کا چکر۔ اس صدی میں بھی ساری ریاست میں ختم نہ ہو سکا۔ ساری انسانیت آج بھی اپنے ہی قید خانے میں گرفتار ہے! اس سے نجات کی کوئی صورت ہی دکھائی نہیں دیتی!

ریاست کشمیر میں انسانوں کی کمائی کا بیشتر حصہ حکومت ٹیکسوں میں لے جاتی تھی جو باقی بچتا وہ کھتری کی بھینٹ چڑھ جاتا تھا جو اون کی لوئی، فاقے اور محنت سے بنائی گئی وہ پٹواری نے سنبھال لی! جو مرغ یا انڈا تھا وہ تھانے دار اور کئی "داروں" کی قربان گاہ پر پیش ہو گیا۔ اس سرزمین میں کسی کو بھی آرام نصیب نہ تھا۔ کوئی بھی انسان سکھی اس دھرتی میں نہ بستا تھا۔ کشمیر کی سرزمین جنت نظیر ہے اس کے قدرتی مناظر، اس کی آبشاریں۔ دل فریب جھیلیں۔ برف سے ڈھکے آسمان بوس پہاڑ اس دردناک غربت اور افلاس کا پس منظر ہیں۔ یہ انسانیت کی ایک دردناک ترین کہانی کیا کم تھی کہ اب ۱۹۴۷ء سے آج تک ایک انسانیت سوز طوفان سے کشمیری عوام کو دوچار کیا جا رہا ہے۔

اس علاقے سے کئی لوگ بے گار سے بھاگ کر برطانوی فوجوں میں جا کر بھرتی ہوتے۔ کئی ملک سے باہر جا کر ملازم ہوتے۔ چوبیس گھنٹے کی پریشانیوں سے نجات حاصل کرتے۔ برسوں تک باہر رہنے کے بعد جب واپس آتے تھے تو اسی چکی میں پسنا پڑتا تھا۔ ہندو افسروں کو ہاتھ جوڑ کر 'جے' بولنا پڑتا تھا۔ جو خوددار سپاہی کے لئے مکروہ ترین عمل تھا۔ آہستہ آہستہ جابر نظام کے خلاف دلوں میں ڈر کی جگہ نفرت پیدا ہونے لگی۔ یہ لوگ جو ریاست سے باہر جاتے تھے اپنی آنکھوں سے بدلتے حالات دیکھ کر آتے تھے۔ سارے ہندوستان میں ایک سیاسی تحریک طوفان کے مانند اٹھ رہی تھی۔ انگریزوں کی جابر حکومت کے

خلاف علمِ بغاوت بلند ہو رہا تھا۔ انگریزوں کی حکومت کے خلاف یہ لوگ تقریریں سن کر آئے ہوتے تھے۔ سارے ملک میں ایک نیا دور کروٹ لے رہا تھا۔ کیا ریاست جموں و کشمیر کا انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا تھا؟

دھوپ۔ ذہن اور پودا

میں نے سکول میں اپنی پڑھائی کی جانب توجہ زیادہ دینی شروع کر دی کھیل کود کے میدان میں اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ استادوں نے میری عزت کرنی شروع کر دی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی کچھ مہربان ہو گئے۔ انگریزی زبان میری کافی اچھی تھی تاریخ میں سرے سے دلچسپی نہ تھی۔ جغرافیہ شروع ہی میں کسی نے اچھی طرح سکھایا نہ تھا۔ حساب اور الجبرا میرے خاصے اچھے تھے مگر جیومیٹری صفر کے برابر تھی۔ افسوس کہ استادوں کو خود تاریخ پڑھانا نہ آتا تھا۔ ہمیں کسی استاد نے تاریخ میں دلچسپی پیدا نہ کروائی۔ میرا خیال ہے کہ آج تک بھی ہمارے ملک کا طرز تعلیم وہی ہے جو پہلے تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ خامیاں آگئی ہیں۔ معیارِ تعلیم گر گیا ہے۔ بچوں کے دلوں سے استاد کا ڈر اٹھ گیا ہے حالانکہ یہ ڈر بچوں کے لئے ضروری ہے اور ڈر ایسا نہ ہو جو "کالی بلا" اور جنون سے ہوتا ہے۔ ایسا ڈر ہو جو ماں باپ سے ہوتا ہے۔ مجھے ایک استاد صاحب کی سزا اس طرح یاد ہے کہ کئی دنوں تک میرے ہاتھوں پر سے نشان نہ مٹ سکتے تھے!

استاد کا بچوں پر وہی اثر ہونا چاہیئے جو سورج کا ابھرتے ہوئے پودے پر ہوتا ہے اور اگر تھوڑی آنچ زیادہ لگ جائے تو پودا سوکھ جاتا ہے۔ دھوپ بالکل نہ نصیب ہو تو پھر پودا نشوونما پانے سے معذور رہ جاتا ہے۔ صحیح قسم کی دھوپ پودے پر بظاہر کوئی اثر نہیں چھوڑتی لیکن پودے کے رگ و ریشے

میں اور اس کی پرورش میں دھوپ کا کتنا دخل ہوتا ہے ؛ کئی استاد رعب اور دبدبہ سے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں ۔ میری دانست میں رعب اور دبدبہ بھی ایک گئی گزری بات ہے ۔ استاد کو سب سے پہلے بچے کو اپنے اعتماد میں لینا چاہیے نہ کہ اپنی کمزوری اس طرح ظاہر کرنا چاہیے کہ بچے استاد کا مذاق ہی اڑانے لگیں ۔ مجھے اپنے چھٹی جماعت کے فارسی کے استاد بلاکی رام صاحب کی کہانی یاد ہے ۔ بلاکی رام صاحب اس قدر بوڑھے ہو چکے تھے کہ آنکھوں میں بینائی بہت کم رہ گئی تھی ۔ فارسی کی کتابیں محض برسوں کے تجربہ سے زبانی یاد تھیں ۔ جو پڑھاتے تھے انہیں محض کلاس میں جانے کی ضرورت پڑتی تھی ۔ آنکھوں کی بینائی سرے سے تھی نہیں لہٰذا ہم خوب آوازیں کستے تھے ۔ جس پر ماسٹر بلاکی رام گالیوں کی بوچھاڑ کرتے تھے ۔

پڑھاتے پڑھاتے ان کی عادت تھی کہ منہ پر خوب ہاتھ پھیرتے تھے یار لوگوں نے ان کے سامنے کے میز پر خوب سیاہی بچھادی ۔ ماسٹر صاحب نے آتے ہی میز پر ہاتھ مارا اور پھر اپنے منہ پر پیشانی سے ٹھوڑی تک سیاہی مل دی ۔ اس کا علم قطعاً ان کو ہوا ہی نہیں ۔ جب سٹاف روم میں گئے تو باقی استادوں نے ان کا منہ دُھلایا ۔ باقی استاد ان کی عمر کی وجہ سے بے حد احترام کرتے تھے ۔

دوسرے دن آتے ہی انہوں نے بڑی بھاری گالی نکالی اور پوچھا یہ کس نے کیا ہے ! سب نے مل کر حیرانگی سے استفسار کیا کہ کیا کس نے کیا تھا ؟ انہوں نے ایک اور گالی دی اور کہا "میرا منہ کالا" ہم نے کہا "جناب آپ کا منہ پہلے سے منہ کالا ہے" (واقعی ان کا رنگ کالا تھا) کہنے لگے تم بہت بدتمیز ہو گئے ہو ! آئندہ سال جو جماعت آئے گی اسے پہلے سے

ٹھیک کر کے رکھوں گا۔

کاش کہ ان کی یہ تمنا بھی پوری ہوتی۔ ہم کئی ساتھی اسی کلاس میں چھوڑ کر آگے ترقی پا گئے اور مجھے چند مہینے ہوئے یہ علم ہوا کہ ہمارے یہ محترم ماسٹر بلاکی رام صاحب ہندوستان کے وزیر گلزاری لال نندہ کے والد تھے۔

۱۹۳۱ء کے موسم بہار میں میں اور حبیب نے میٹرک کا امتحان دیا۔ اکبر ہم سے پیچھے رہ گئے تھے بلکہ ہم لوگوں نے انھیں آٹھویں جماعت میں ہی پیچھے چھوڑ دیا تھا بورڈنگ ہاؤس میں ان کا ساتھ رہتا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کی بھی سن لیجئے۔ ہمارے پرانے نگران تو شادی کر کے چلے گئے۔ وہ بڑے ہوشیار تھے۔ سری نگر کے رہنے والے تھے۔ کشمیری طرز کی پگڑی پہنتے تھے۔ کبھی رعب کبھی محض حسن تدبیر سے ہمارے ساتھ دن گزارتے تھے۔ ہم میں سے کئیوں کو دوست بنا رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کو چوبیس گھنٹے کی باقاعدہ رپورٹ پہنچ جاتی تھی اس صورت میں بغاوت نہ ہو سکتی تھی البتہ چند من چلوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں سے پرچے نکال لئے۔ یہ دفتر بورڈنگ ہاؤس کی چار دیواری کے اندر تھا لہذا دفتر کے روشندان سے داخل ہو کر لڑکوں نے پرچے نکال لئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو خبر ہوئی تو باقاعدہ انکوائری بٹھائی گئی مگر طلباء میں باہمی اتفاق قائم رہا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ معاملہ بہر حال بھلا دیا گیا۔

ہماری خوش قسمتی سے جو نئے صاحب نگران بورڈنگ ہاؤس آئے وہ بڑے سادہ سے مولوی صاحب تھے۔ گاؤں کے مڈل سکول سے تشریف لائے تھے۔ ڈاڑھی خاصی لمبی تھی۔ شہر میں معلوم ہوتا تھا پہلی بار قدم رکھا ہے زبان نیم پہاڑی، نیم فارسی، ملے جلے عربی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال

فرماتے تھے ۔ اس سے اچھا شگوفہ کب ہاتھ آتا تھا؟ ہم نے سازش کر کے رات کو ان کی چھت جو ٹین کی چادروں کی تھی، پر پتھروں سے حملہ شروع کر دیا اور باہر سے ان کا دروازہ بند کر دیا۔

مجھے صحیح یاد نہیں کہ ہم بڑے اور سینئر لڑکوں کی یہ سازش کیوں اور کس لئے مولوی صاحب کو دق کرنے کی تھی کہ کسی من چلے نے ایک بارود کا گولہ کہیں سے لا کر روشندان سے ان کے کمرے میں پھینکا۔ گولہ جا کر ان کی چارپائی کے نیچے پھٹا اور مولوی صاحب محترم چارپائی سمیت فرش پر جا گرے پھر کیا تھا طوفان برپا ہو گیا۔ دوسرے دن ایک عرضی دس صفحوں پر مشتمل ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں گزاری گئی۔ تحقیقات کا حکم دے دیا گیا۔ تمام بورڈنگ ہاؤس میں ایک طوفان برپا ہو گیا مگر آج تک یہ پتہ نہ لگ سکا کہ "وہ دیسی بم" کہاں سے آیا تھا کیونکہ بارود کے گولے کو اب مولوی صاحب نے "دیسی بم" کہنا شروع کر دیا۔ تمام معاملے کو ایک بڑی حکومت کا تختہ ہلانے والی سازش کے نام سے پکارنے لگے۔

جب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تو ہم کبھی دل لگی میں جب مولوی صاحب سے گولے کا ذکر کرتے تھے وہ سب سے پہلے ہی کہتے تھے کہ "گولہ" نہیں تھا۔ یہ بم تھا! یہ مولوی صاحب ابھی تک زندہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آزاد کشمیر کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہیں۔

میں ابھی نانویں جماعت میں تھا کہ ایک بڑا دلچسپ واقعہ مجھے پیش آیا چھٹیوں میں میں اپنی بڑی بہن کے یہاں ساتھ کے گاؤں جایا کرتا تھا۔ ساون (جولائی) کی رت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں ان کے ہاں ایک خوبصورت اور مضبوط گھوڑا تھا۔ گھوڑے کی سواری کا شوق مجھے بے حد ہوا کرتا تھا۔

جسے پورا کرنے کے لیئے ایک کھیت میں جس کی لمبائی خاصی تھی۔ میں گھوڑے کو لے گیا۔ گھر والوں نے منع اس لیئے نہ کیا کہ یہ خیال کرے گا اس میں گھوڑا نہ دینے کی کوئی صورت مقصود ہے مگر ایسا نہ تھا میری بہن نے البتہ میری منتیں کرنی شروع کر دیں کہ گھوڑے پر سواری نہ کرنا یہ بہت تیز دوڑنے والا ہے۔ اگرچہ میں زین ڈالے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سڑک پر گھوڑے کا دوڑانا اور بات ہے۔ میں نے گھوڑے کو کھیت میں دوڑانا شروع کیا۔ ایک دفعہ گھوڑے نے مجھے گرایا میری بہن نے پھر میری منتیں کیں۔ اب تو عزت کا معاملہ درپیش تھا۔ گھوڑے پر سواری نہ کرتا تو بزدل تصور ہوتا۔ میں پھر گھوڑے پر چڑھا اب کہ فوراً گھوڑے نے گرا دیا۔ تیسری بار جو چڑھا تو گھوڑے نے ایک ایک کھیت سے دوسرے میں زور کی چھلانگ لگائی۔ میں جا کر کھیت کی منڈیر پر پڑا اور میرا دایاں بازو ٹوٹ گیا۔

بہر حال بازو جڑوایا مگر اپنے والد کو گھوڑے کی کہانی نہ بتائی ورنہ خدا جانے اور کیا حشر ہوتا۔ کئی سالوں کے بعد ان کو جب ان کو یہ علم ہوا کہ گر کر بازو ٹوٹنے والی کہانی غلط تھی مگر پھر بھی انھوں نے غصہ کیا۔ میٹرک میں ہم لوگ پاس ہو گئے۔ حبیب اور میں لاہور اسلامیہ کالج میں داخل ہونے کے لیئے آ گئے۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ یہ تحریک کس کی تھی کہ لاہور میں پڑھائی جاری رکھی جائے۔ سری نگر میں دس روپے ماہوار میں آسانی سے اور خوشحالی گزار کے لڑکے بی۔ اے تک پڑھتے تھے۔ ایک روپے میں چالیس سیر چاول ملتے تھے۔ سری نگر میں سبزی اور میوہ تو بھوسے کے بھاؤ تھا لاہور کا نام سنا کرتے تھے مگر لاہور دیکھا اور لاہور میں آ کر جو کچھ گزرا وہ ایک الگ داستان ہے۔

حصّہ دوم

تلاشِ علم لاہور شہر میں

میٹرک میں حبیب کے نمبر مجھ سے زیادہ تھے اور انہیں ۴/۳ وظائف بھی حاصل ہوئے۔ میرے نمبر اتنے نہ اچھے آئے اس کی وجہ ظاہر ہے میں کتابی کیڑا نہ تھا اور پڑھائی کے ساتھ ہی ساتھ کھیل کود میں بھی حصہ لیتا تھا حبیب مجھ سے زیادہ ذہین اور محنتی بھی تھے۔ اسلامیہ کالج پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں ہم سے بھی کئی گئے گزرے موجود ہیں۔ داخلہ حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ ہمارے استاد مولوی نذیر احمد صاحب بھی لاہور میں موجود تھے۔ پلونچھ کا ہائی سکول چھوڑ کر مولوی صاحب کم و بیش دنیا کے دھندوں سے منہ موڑ چکے تھے۔ انہوں نے نمک کھانا یا وہ خوراک جس میں نمک یا میٹھا ہو چھوڑ دی تھیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ دنیاوی خواہشات پر اس طرح ہی فتح حاصل ہو سکتی ہے اور کچھ مدت تمام دنیاوی خواہشات مارنے سے ہی اپنے نفس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ہم جو ان کے اچھے طالب علموں میں سے تھے، ایک دن ان کی ہی قیام گاہ پر رات گزارنے چلے گئے۔ ہم نے ابھی تک اپنی مستقل قیام گاہ بنائی ہی نہیں تھی۔ مولوی صاحب مصری شاہ کے محلہ سے آگے ایک باغ کی مسجد میں قیام رکھتے تھے۔ اس مسجد میں سوائے موٹی موٹی چٹائیوں کے کوئی

رہائش کا بندوبست دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ شاید کوئی مکان کی صورت میں کوئی کمرہ موجود ہو۔ اس شام کو کھانا بھی جو ہم نے کھایا تھا وہ اس لمبی مسافت میں جلدی ہی ہضم ہو گیا۔ مسجد میں بیٹھ کر ہم نے جوتے اتارے منہ ہاتھ دھویا۔ مسجد کا فرش توے کی طرح گرم تھا۔ یہ مئی کا مہینہ تھا۔

اسی انتظار میں رات نے آ لیا کہ شاید مولوی صاحب قبلہ کسی مستقل قیام گاہ کی طرف ابھی لے جاتے ہیں۔ انھوں نے نماز پڑھی۔ ہم نے بھی بامر مجبوری سجدے کر لئے۔ ہم اس قدر مستقل نمازی نہ بنے تھے سچ پوچھئے تو لاہور کی طوفانی گرمی نے ہمیں مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا تھا۔ ہمارے لئے تو لاہور کی سرزمین دوزخ سے کم نہ تھی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مولوی صاحب نے لمبا سا ڈکار لیا۔ اللہ کا شکرانہ ادا کیا اور ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے "بچو سو جاؤ" یہ حکم ہمارے لئے معمولی بات نہ تھا۔ نیند کہاں تھی! دن کی دوڑ دھوپ سے پاؤں تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ نیچے مسجد کا فرش گرم تھا۔ بہر حال ہم سونے کی کوشش میں لیٹ گئے تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی نیند آ گئی۔ ابھی آنکھیں ذرا بند کی ہوں گی کہ مچھروں کے تابڑ توڑ حملے شروع ہو گئے۔ پھر اس طرح ہم پر حملہ آور ہوئے جیسے جرمن ایر فورس نے اگست ۱۹۴۰ء میں لندن پر حملے کئے تھے ان مچھروں کا کوئی سدباب ظاہر ہے نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی ہم بے بسوں کے پاس بچاؤ کا چارہ پھر وطن سے اس قدر دور! کہاں وادی پونچھ کے دلفریب پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوائیں اور کہاں لاہور کی مسجد شریف میں گرے ہوئے ہم بے کسوں کی یہ حالت! آخر ہم نے سوچا کہ اس کا کوئی علاج تو ہو اور "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"! کے مطابق ہم نے مسجد شریف کی چٹائیاں لیں اور اُنھیں

پلیٹ کر انہیں غاروں کی صورت میں تبدیل کیا۔ ان غاروں کے بیچ میں دونوں گھس گئے شکر ہے کہ راتیں لمبی نہ تھیں جلدی ہی مرغ نے اذان دی تو مولوی صاحب نے ہمیں اٹھایا جیسا کہ مولوی صاحب ہمیں پونچھ ہائی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جنوری اور فروری کی سردی کی راتوں میں ۴ بجے صبح ہی اٹھا دیا کرتے تھے۔

شہر لاہور میں حبیب اور میں دونوں اجنبی تھے۔ نہیں معلوم تھا کہ آخر یہاں کے لوگ رہتے کس طرح ہیں اور شہر بھر میں چوبیس گھنٹے کی دوڑ دھوپ وغیرہ کا مطلب کیا ہے؟ ہم نے اپنے لئے کرایہ کا کمرہ تلاش کرنا شروع کیا مئی جون کی دھوپ میں خوب چکر کاٹے۔ طرح طرح کے انسانوں سے پالا پڑا۔ انجام کار ایک سردار جی (سکھ) نے ہمیں ایک بڑی بلڈنگ کی اوپر کی منزل میں ایک کمرہ مرحمت فرمایا جس کے دو حصے تھے۔ پانی نیچے گلی میں تھا۔ بہر حال یار لوگوں نے کمرہ لے لیا۔ کچھ بستر ے کا انتظام کیا۔ چارپائی وغیرہ بھی خرید لی گئی۔ خیال تھا کہ کھانا کسی ہوٹل میں کھا لیا کریں گے۔

کالج میں جب پہلے روز حاضر ہوئے تو ترکی رومی ٹوپیاں ہم نے پہن رکھی تھیں اور اپنی اپنی کلاسوں کے کمرے بڑے انہماک سے ڈھونڈ رہے جا رہے تھے۔ حبیب مجھ سے الگ ہو گئے کیونکہ اس نے سائنس کے مضامین لے رکھے تھے یہاں مجھ اکیلے کے سر پر ہی ایک مصیبت آن پڑی۔ میں کالج کے برآمدہ میں کھڑا نوٹس پڑھ رہا تھا کہ ایک جانب سے ایک صاحب بڑی شان سے تشریف لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ "نکار" ہے۔ پھر ٹوپی میرے سر سے ایک جھپٹا مار کر اتار لی۔ یہ ٹوپی چند دن ہوئے ہم نے انارکلی بازار سے خرید کی تھی اور ٹوپی تھی بھی خاصی اچھی۔ فرمانے لگے۔

نواب صاحب! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ میں نے سوچا کہ یہ ضرور کوئی پرنسپل کا قریبی ہے جو اس طرح باتیں کرتا ہے لہذا میں نے بڑے ادب و احترام سے جواب دینا ہی چاہا تھا کہ انھوں نے میری رومی ٹوپی جیب میں ڈالی اور چلتے بنے۔ برآمدے میں کافی دور تک میں نے اس کا ساتھ دیا وہ آگے نکل کر ایسا غائب ہوا کہ آج تک دوبارہ دکھائی نہ دیا۔

یہاں اس قسم کی کئی وارداتیں پیش آئیں جنہیں با دلِ ناخواستہ برداشت کرنا پڑا گویا کہ "قہرِ درویش برجانِ درویش" دو تین ہم بھی اسی طرح لڑکوں نے کھسکا لئے۔ کاپیاں بھی آگے پیچھے ہوئیں اور جب یہ پتہ چلا کہ کالج میں کتابیں وغیرہ لے جانی ضروری نہیں ہیں تو کتابوں کی خیریت گزری۔

لاہور گرمی کا ہم پر اتنا اثر ہوا کہ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی اور ہم دونوں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے جون کے لمبے لمبے دھوپ والے دن ایک گرم کمرے میں ہم تڑپ کر گزارتے گویا ہم ٹھنڈے ملک کے رہنے والے لوگ ہیں بے دردی سے جہنم میں جھونک دیئے گئے ہیں تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا دوستوں کا حلقہ بڑھتا گیا۔ شام کو کھیل کود یا سیر میں وقت گزرنے لگا کچھ ہم اس قیامت خیز ماحول سے مانوس ہونے لگے اور کالج کی دلچسپیاں بھی بڑھ گئیں۔

میں نے کالج میں داخل ہو کر کھیل بالکل ترک کر دیے اور مجھے اپنی پڑھائی سے زیادہ دلچسپی ہونے لگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہوا کیونکہ میں اپنے سکول کے ہاکی اور فٹ بال کے بہترین کھلاڑیوں میں سے تھا لہذا یہ تبدیلی مجھ میں کیوں کر واقع ہوئی اس کے صحیح اسباب مجھے آج تک معلوم نہیں اگرچہ عزم کر کے ایک چیز ترک کر دینے کا فیصلہ نہیں تھا

بلکہ محض زندگی میں نئی کیفیت پیدا ہو رہی تھی جب ایسا ہوا تو میں نے فراغت کا وقت اپنی پڑھائی کی طرف لگانا شروع کیا۔ حالانکہ کالجوں میں آکر بہت کم لڑکے ایسا کرتے ہیں کہ اس طرح سب کھیلوں اور تفریح سے منہ موڑ کر پڑھائی کی طرف لگ جائیں۔

مجھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق بچپن سے تھا اور یہ میری کمزوریوں میں سے ایک کمزوری اب بھی ہے۔ سکول میں مجھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق اس قدر تھا کہ میں کئی بار ناجائز اخراجات کا مرتکب ہوا اور اس کے لئے سزا بھی پانی پڑی۔ سکول کا ماحول ایسا نہ تھا کہ خواہ مخواہ ہی کپڑوں کی طرف توجہ دینی پڑتی ہو مگر کالج میں آکر اس کے برعکس طالب علموں میں سوٹ سلوانے اور اچھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق ابھر آتا ہے اور لاہور کے کالجوں کے طالب علم تو تمام یونیورسٹیوں کو اس معاملے میں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں مگر حبیب اور میں شلوار قمیص اور کوٹ پہنتے تھے۔ سر پہ ٹوپی رکھتے اور بس بڑی دیر بعد ننگے سر پھرنا شروع کیا۔ یہ ایک قدرتی حجاب تھا جو ہم میں دیر تک رہا۔ باقی طالب علم چند دنوں میں ہی لاہور کے خوش پوش لوگوں میں شمار ہونے لگے۔

لاہور فلم کی دنیا کا شہر ہے بمبئی کے بعد صرف لاہور شہر فلم کی دنیا ہے اور سینما جانے کا رجحان تو طالب علموں میں عام طور پر ہوتا ہے پھر گلی گلی اشتہار اور سڑکوں پر فلموں کے پوسٹر اتنے اشتعال انگیز اور جاذب نظر ہوتے کہ طلباء محو توجہ ہو جاتے مگر دونوں چار سال کی طویل مدت میں صرف ایک دفعہ میکلوڈ روڈ پر ایک فلم دیکھنے گئے جو ہمارے بی۔ اے کے نصاب میں ناول کی صورت میں شامل تھی اور محض تعلیمی شغف سے

فلم دیکھی گئی۔ اس زمانہ میں ہم نے سوٹ اس وقت سے پہننا شروع کیا
جب ۱۹۲۸ء میں ولایت جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

کالج میں انگریز ندگی آہستہ آہستہ بدلنے لگی اور ہم بھی سیانے بنتے گئے۔
دوستوں سے باتیں سیکھیں گاؤں کی سادگی جاتی رہی اور میٹھے جھرنوں کا شعور ختم ہونے
لگا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جب باقاعدہ پڑھائی شروع ہوئی تو اپنی اپنی جماعت میں
ہم دونوں ہوشیار نکلے کہ اساتذہ ہماری عزت کرنے لگے اور ساتھی بھی۔ پھر اسی
برآمدے میں جہاں میری رومی ٹوپی اڑا لی گئی تھی میں ہی بصد افتخار ہم لوگوں نے
اپنے آپ کو ٹہلتے ہوئے پایا۔

وہی مرحلے۔ وہی منزلیں

جولائی میں لاہور کے کالج بند ہوتے ہی ہم نے اپنی کتابیں سنبھالیں
راولپنڈی کی ٹرین میں مشکل سے سوار ہوئے۔ لاہور سے راولپنڈی کا سفر اس
زمانے میں بڑا مشکل کام تھا۔ لاہور سے کھڑے کھڑے روانہ ہوئے تو ساری
رات بیٹھنے کو جگہ نہ ملی۔ راولپنڈی پہنچ کر یہ امید بندھی کہ اب زندہ گھر پہنچ جائیں
گے۔ ان دنوں کہوٹہ سے آگے پیدل جانا پڑتا ہے۔ کہوٹہ جو راولپنڈی سے
بیس میل مشرق میں ہے، آخری منزل تھی جہاں تک سکھوں کی لاریاں آپ کو
پہنچا سکتی تھیں۔ ہم نے کہوٹہ سے دو مزدور کتابوں کے لئے ساتھ لئے وقت
چار بجے شام کا تھا مگر یہ خیال نہ آیا کہ چار بجے چل کر ہم اگلی منزل پر کس طرح پہنچ
سکیں گے جبکہ اگلی منزل بیس میل دور دریائے جہلم کے کنارے ہے کہوڑے
راولاکوٹ ہمارا قصبہ پیدل راستہ سے کم و بیش ۵۰ میل پڑتا ہوگا۔

ہم نے سن رکھا تھا کہ پل تک پہنچنے تک پہلے راستہ میں دشوار گزار جنگل

گھاٹیاں اور کسیاں آتی ہیں جہاں ڈاکو لوگ ہم ایسے مسافروں کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں اور رات کو کوئی شکار مل جائے تو وہ بچ نہیں سکتا۔ گھر کی طرف جلدی سے روانہ ہونے کے شوقِ بچگانہ نے یہ سوچنے کا موقع نہ دیا کہ آخر ہم اس قدر سورج ڈھلے روانہ ہو کر اپنی منزل پر کیسے پہنچیں گے۔ بہر حال جب ہم چل پڑے تو آگے جا کر مزدور بھی آہستہ آہستہ چلنے لگے اور رات سر پر آگئی۔ ہمیں مزدوروں پر بھی شک گزرنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ بھی ڈاکوؤں کے ساتھی ہیں ہم نے مزدوروں کو پیچھے چھوڑ دیا اور بھاگنے لگے۔ ابھی سفر کئی میل دور تھا جتنا بھاگتے تھے اسی قدر خوف زدہ ہوتے تھے منزل اس لحاظ سے بھی دور ہو جاتی تھی کہ اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا۔ جنگل اور گھنا ہوتا جاتا تھا۔ ہمارے دل سینوں میں بری طرح دھڑکنے سے لگے تھے۔ جب ہم بھاگتے تھے تو سڑک کے کنارے پر ذرا سی آواز (پرندوں کی ہی کیوں نہ ہو) ہم کو چونکا دیتی تھی۔ دل بیٹھ جاتا تھا۔ خدا جانے اس حالت میں ہمارا دل کتنی بار کس کس طوفان سے گزرا اور خدا جانے کس طرح بھاگتے ہوئے ہم نے آخر ایک مقام پر پہنچ کر ایک دوکان پر ڈیرے ڈالے اور کل کے سفر سے لاپروا ہو کر اپنے سامان سے بے نیاز ہو کر لیٹ گئے۔ ہمارے مزدور رات کو دو بجے وہاں پہنچے۔ ہمیں کوئی امید ہی نہ تھی کہ ہم اپنے مزدوروں کو اس جگہ پر دیکھ سکیں گے۔ لاہور کی طوفان خیز گرمی سے واپس آکر پونچھ کی بلند پہاڑیوں کی آب و ہوا بڑی سکون بخش ثابت ہوئی اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ماہ جون میں میدانوں سے ان پہاڑوں میں پہنچ جانے سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔

ٹوٹ گئی مہرِ سکوت

لاہور میں حبیب اور میں نے کئی مکان بدلے۔ اب ہم خاصے ہوشیار ہو گئے تھے۔ ہم نے سکھوں والے محلے ہی سے پناہ مانگی اور ہم ایک دوسری جگہ چلے گئے جو مسلمانوں کا محلہ تھا۔ کمرے بھی ہمیں اچھے مل گئے اور یہاں ہم نے قدم جما کر رہنا شروع کیا تاہم حیرانی کی بات ہے کہ میں کالج میں آ کر بالکل بدل گیا مگر کیسے اس کے اسباب میں نہیں بتا سکتا البتہ یہ خواہش ضرور تھی کہ میرا شمار بہترین طالب علموں میں ہو کئی بار میں نے اس بات پر غور کیا اور آج تک بار بار خیال آنے پر سوچتا ہوں کہ یہ کیسے ہو گیا پھر بھی صحیح طور پر انگلی لگا کر نہیں کہہ سکتا کہ اس تبدیلی کی وجوہات کیا تھیں۔ سکول میں سخت گیر طالب علموں میں سے تھا۔ مجھ میں جبر و تشدد تھا۔ ہندو لڑکوں کے لئے تو میں ایک بلا تھا۔ سب ہندو لڑکے مجھ سے پریشان رہتے تھے۔ مسلمان لڑکوں سے بھی بسا اوقات لڑائی ہو جاتی تھی۔ شرارت مجھ میں اس قدر تھی کہ لڑائی کی صورت میں شکایت ہونے پر ہر استاد بھی قصوروار مجھے ہی ٹھہرایا کرتا تھا گویا وہ فرض کر لیتے تھے کہ قصور میرا ہی ہوگا یا وہ یہ جانتے تھے کہ حملہ آور ہونے کا جذبہ اور اقدام مجھ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

لیکن کالج میں آ کر میں ایک خاموش طالب علم بن گیا تھا۔ آج تک دوست خاموش طالب علم کے نام سے مجھے جانتے ہیں۔ میں نے دوسروں سے زیادہ گفتگو میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ اپنی کتاب لے کر جہانگیر کے مقبرہ یا لارنس باغ میں (جسے اب باغ جناح کہتے ہیں) چلا جاتا تھا۔ ہمارے دوستوں کا حلقہ چند افراد پر مشتمل تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد حبیب بورڈنگ ہاؤس میں چلے گئے تو میں ایک

دوست محبوب کے پاس جا کر رہنے لگا۔ محبوب نہایت ہی مخلص، سیدھا سادہ اور لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ میں اور وہ اقتصادیات کی جماعت میں اکٹھے بیٹھنے لگے تھے اس لئے اس سے راہ و رسم ہو گئی۔ حبیب کے دوست نذیر رضوی (جو آج کل مجسٹریٹ ہیں) تھے اور شاہد بھی حبیب کے بے تکلف دوست بن گئے بعد میں سرینگر کے کچھ اور کشمیری دوست ہمارے ساتھ آ گئے اور ہم سب اکٹھے ہو کر بھی کرایہ کے مکان پر کچھ عرصہ کے لئے رہتے رہے۔ شاہد گورنمنٹ سروس میں ہیں۔ محبوب وکالت کرتے ہیں یہ سب لوگ بعد میں مہاجر ہو کر پاکستان آ گئے۔ یہ لوگ ہانسی۔ حصار اور انبالہ کے رہنے والے تھے اور ہم سب آپس میں بڑے بے تکلف دوست بن گئے۔

محبوب میں عجیب کشش تھی۔ شکل بھونڈی مگر دل شیشے کی طرح صاف تھا۔ ہر ایک کو دوست بنا لیتا تھا بے حد لاپرواہ قسم کا آدمی تھا۔ زندگی میں بڑا آدمی بننے کی کوئی تمنا نہ تھی۔ نذیر ہم میں زیادہ ہوشیار دوست تھے اور باتیں کرنے میں تو بہت ہوشیار تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی بھی اسلامیہ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ہم چاندنی راتوں میں اسلامیہ کالج کے میدان میں بیٹھ کر پہروں نذیر کی باتیں سنا کرتے تھے۔ کبھی تھکتے ہی نہیں تھے شاہد سادہ مزاج اور پیاری عادت کا مالک تھا۔ شادی کے بارے میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شہر میں بیاہ رچائے مگر گاؤں کے رشتے اتنے مضبوط تھے کہ وہ ان کو توڑنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

محبوب 'خیالی پلاؤ' پکانے والا آدمی تھا اور تصورات ہی میں دور دور تک جا پہنچتا تھا اپنی طبیعت کے اسی رجحان کی وجہ سے "شیخ چلی" کا "ہمزاد" معلوم ہوتا تھا۔ بے حد بامذاق آدمی تھا۔ ہم یہی چار پانچ دوست

اکٹھے کھانا کھایا کرتے تھے ایک چھوٹا سا ہوشیار پوری نوکر رکھا ہوا تھا۔ جو گھی کا ایک ٹین ہمارے لئے ساتھ لاتا تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک شام ہم سیر کو نکل گئے اور سیر کر کے بھوک سے بلکتے ہوئے واپس پہنچ کر کھانا مانگا تو نوکر نے کہا کہ "آپ کا سارا کھانا محبوب صاحب کھا گئے"! ہم حیران رہ گئے مگر یہ سچ تھا کہ چار آدمیوں کا کھانا "محبوب صاحب" کھا گئے اور ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی ہم سمجھتے تھے کہ وہ بیمار ہو جائے گا مگر وہ دوسرے دن سب سے پہلے اٹھنے کے بعد کالج تشریف لے گئے اس نے ہم سے ذکر ہی نہیں کیا کہ یہ حادثہ کیسے ہوا۔ اپنی متانت اسی طرح قائم رکھی۔ ہماری پریشانی کا نوٹس لینے سے احتراز کیا اور زیرِ لب مسکراتے رہے آخر اس طرح اس کی خاموشی سے ایک "جنگِ عظیم" ہوتے ہوتے رہ گئی!

ایک دفعہ یہی حضرت شاہد کا پارسل خود جا کر ریلوے سٹیشن سے لے آئے رسید کس طرح چرائی یا اس کے خط سے اڑالی یہ خبر نہیں ہے۔ اس کے پارسل سے رضائی اور سویٹر نکال لیا۔ رضائی نہایت ہی اطمینان سے اوڑھ لی اور سویٹر بڑے اعتماد اور شوق سے زیبِ تن فرمالی۔ شاہد کو ایک ماہ تک پریشان رکھا۔ یہ سب کچھ بے تکلفی میں ہوتا ہے۔ کتنا اچھا وقت تھا وہ سب ہماری اٹھتی ہوئی جوانیاں تھیں۔ ہم اپنی اپنی خواہشات دلوں میں دبائے پڑھتے رہتے تھے اور زندگی کے لطیف پہلوؤں سے بالکل ناآشنا تھے۔

لاہور ————!

علم - تہذیب اور عرفان کا مرکز

لاہور کا ماحول ہندوؤں کی وجہ سے ذرا مختلف تھا۔ بڑی سوشل آزادی تھی۔ ہندو عورتیں آزادی سے لاہور شہر اور مال روڈ کی سیر کیا کرتی تھیں۔ ہندو لوگ ویسے بھی مغربی تہذیب کو پورے طور پر اپنا چکے تھے مگر مسلمان اس معاملے میں پیچھے تھے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ ٹھیک تھا یا نہیں مگر لارنس باغ میں ٹینس کھیلتی ہوئی نوجوان لڑکیاں دیکھنے کے لئے بسا اوقات آوارہ گردی کو نکلتے تھے تو اس میں میرا شریک محبوب ہی بنتا تھا۔ حبیب اپنے سائنس کے چکّر میں معروف اور مجبور تھے۔ نذیر کو لڑکیوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اگر تھی بھی تو اس کا اظہار بہت کم کرتے تھے۔ ہمارا شغل محض چکر بازی تھا۔ اس سے زائد جرأت نہ تھی نہ اس خطرناک میدان میں قدم رکھنے کا ارادہ ہی تھا یہ خواہش ضرور تھی کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ ایک دبی سی خواہش کس دل میں نہیں ہوتی ایک گدگدانے والی "تمنا" کس نوجوان کے دل میں چٹکیاں نہیں لیتی! مگر میرے لئے اس منزل تک پہنچنے کے لئے کئی امتحانات سے گزرنا ناگزیر۔

میں ہر لحاظ سے شرمیلا واقع ہوا تھا۔ حبیب مجھ سے زیادہ شرمیلا تھا۔ آج بھی حبیب صاحب کا منہ بہت جلد سرخ ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود کالج یونین میں حبیب اردو اور انگریزی دونوں میں تقریر کیا کرتے تھے۔ نذیر بھی کچھ کم نہ تھا مگر محبوب کو کسی معاملہ میں کبھی شرم آئی ہی نہیں تھی۔ شاہد البتہ تحریر و تقریر کے نام سے گھبراتے تھے۔ مجھے

تقریر سننے کا شوق تھا۔ تقریر کرنے کے خیال سے بال بال میں پسینہ آجاتا تھا۔ سارے کالج کی زندگی میں اردو یا انگریزی میں کوئی تقریر نہ کی مگر اردو کی مجالس میں باقاعدگی سے جاتا تھا۔ ہمارے سارے دوست اردو ہی بولتے تھے۔ اس لئے ہم نے بھی اردو ہی اپنی زبان بنالی۔ گو پنجابی بھی بول سکتا تھا مگر بولتا نہیں تھا حبیب کچھ پنجابی دوستوں میں پنجابی زبان بولنے لگے۔ میں نے پنجابی میں کبھی گفتگو نہ کی نہ پنجابی بولنے کی کوشش۔

میرا کالج کے اچھے طلباء میں شمار ہونے لگا۔ الیف۔ اے میں اچھے نمبر آئے اور وظیفہ بھی مل گیا۔ اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ اقتصادیات کا مضمون میرا بہترین تھا۔ کالج کے استادوں نے ہر مرحلہ پر میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور یہ حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو شاید میں اپنی محنت میں سست پڑجاتا۔ طالب علم کے لئے استادوں کی حوصلہ افزائی نہایت ضروری ہے جس سے لڑکوں کی زندگی بدل جاتی ہیں اور بدل سکتی ہیں۔ اگر استاد جائز پر صحیح طالب علم کی صحیح الفاظ میں حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ کاش کہ میری طرح کے استاد سب کو نصیب ہوں۔ میرے اقتصادیات کے استاد ڈاکٹر ایس ایم اختر تھے جو آج کل غالباً لاہور یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب صرف میری ہی نہیں میرے ساتھیوں کی بھی اسی طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اقتصادیات کے طلباء میں میں ان کا بہترین طالب علم تھا۔

۱۹۳۷ء میں بڑی تبدیلیاں ملکی سیاسیات میں آئیں۔ ہندوستان میں نئی اصلاحات کے تحت سلف گورنمنٹ دی جانے لگی تھی۔ لاہور کا ماحول پر لطف تھا۔ جگہ جگہ تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ علمی مباحثے ہوتے

رہتے تھے۔ لاہور شہر شمالی ہندوستان کے کلچر کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لاہور نے بڑے بڑے شاعر پیدا کیے۔ اقبال کی شاعری اور تخیل نے اسی جگہ پرورش پائی اور پروان چڑھے۔ سارے لاہور کا پس منظر اس کے تاریخی محلات ہیں۔ راوی کے کنارے نورجہاں مدفون ہے اور ساتھ ہی جہانگیر کا مقبرہ اپنی گزری ہوئی تاریخ کی عظمت کا نشان ہے۔ شاہی قلعہ مسلمان بچے کے تخیل اور ذہن کے لئے ایک الہام کا کام دیتا ہے۔ میں نے اقبال کی فارسی کی شاعری اور اردو کی شاعری لاہور کے اسی پس منظر میں پڑھی تو اس کی شاعری کے سارے تاریخی پس منظر سے تب ہی روشناس ہوا۔ میرے ذہن اور تخیل نے جب پرورش پائی تو اس ذہن کا پس منظر بھی یہ لاہور کا شہر بنا۔ شالامار میں ہفتے میں پانچ روز میں جاکر گھنٹوں سوچتا رہتا اور گزرے ہوئے عہد کی عظمت پر غور کرتا رہتا۔

—— یہ کس قدر خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس نایاب تعلیم کی کوئی قیمت نہ تھی جو لاہور شہر کی گلیوں کوچوں بازاروں اور باغوں سے حاصل ہوتی ہے۔

لاہور شہر کا ماحول سیاسی رجحان کی ترقی کے لئے بڑا سازگار ہے ہم میں سے کئی طلباء سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے۔ بعد میں پاکستان کی تحریک اسی شہر میں ترقی پذیر ہوئی۔ پاکستان کا ریزولیوشن اس شہر کی تہذیبی اقتدار کا مرہون منت بنا۔ یہاں کے طلباء نے یقیناً پاکستان کی تحریک پروان چڑھانے میں ایسا کردار ادا کیا جو تاریخی ہوتے کے علاوہ استقلال اور اولوالعزمی کی مثال بھی ہے۔ اس شہر میں مسلمان طالب علم سری نگر سے لے کر کولمبو اور ملایا تک سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ہمارے

ساتھ بورنیو اور سماٹرا کے طالب علم تھے۔ اسلامیہ کالج میں کابل اور ایران سے بھی طلباء آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اس حصہ زمین کا مرکز یہی کالج تھا۔ میں یہاں یہ کوشش نہیں کر رہا کہ علی گڑھ سے اس کا مقابلہ کروں۔ کیونکہ علی گڑھ کی حیثیت تاریخی طور پر بہت بلند ہے۔ علی گڑھ غالباً ساری دنیا کے مسلمانوں کا تعلیمی مرکز بن چکا تھا۔ علی گڑھ کے طالب علموں نے بھی سارے ہندوستان میں پاکستان کی تحریک کو محنت اور مشقت سے تقویت دی جس میں کلام نہیں ہے۔

پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت بلند کرنے میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا بڑا ہاتھ ہے۔ بلکہ اس طرح جس طرح کہ حیدر آباد والوں نے اور خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب نے اردو زبان کی خدمت کی ہے۔

سرسید کی بے نظیر تعلیمی تحریک پروان چڑھنے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے بے حد ترقی کی ہے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دوران مسلمانوں کا اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی نظام مٹی میں مل گیا تھا انگریزوں نے ابتداء جس طرح ہندوؤں کی حوصلہ افزائی اور پرورش کی۔ اس سے ہندو اقتصادی طور پر اپنے قدم مضبوط کرتے رہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی اقتصادی نظام میں ہندوؤں کا اسّی فی صد دخل تھا۔ ادھر انگریزوں کو مسلمانوں پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے پالیسی کے طور پر ہندوؤں کو نوازنا شروع کیا۔ بڑی بڑی ملازمتیں ہندوؤں کو ملنے لگیں وہ حکومت کے اہم عہدوں پر پہنچ گئے۔ اقتصادی طور پر وہ پہلے ہی مضبوط تھے مزید حوصلہ افزائی ہوتی گئی تو مسلمانوں کے خلاف تعصب بھی رنگ لایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں قوموں نے مل کر مسلمانوں کو اس طرح پامال کیا کہ ان

کی سوشل اور پولیٹیکل حیثیت ختم ہو کر رہ گئی۔

اس طوفان کے خلاف سرسید نے جہاد کیا تو اپنے لوگوں نے نادانشمندی کی وجہ سے مخالفت بھی کی۔ سرسید کی تحریک ناکام ہو جاتی تو یہ عین ممکن تھا کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں بھی وہی حشر ہوتا جو ان کا سپین میں ہوا تھا ـــــ لاہور پر سرسید کی تحریک کا گہرا اثر تھا ـــــ اور آج لاہور جس ورثہ کا امین ہے وہ تہذیبی، علمی، مذہبی ہی نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی بھی ہے!

نقوشِ سیاست

جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں، لاہور میں رہ کر میں نے اپنی تعلیم کی جانب ہی توجہ دی کیونکہ مجھے یہ احساس اچھی طرح ہو چکا تھا کہ میرے والدین کی یہی منشا ہے کہ محض تعلیم کی تکمیل کر دی جائے لہٰذا میری تمام توجہ اسی طرف ہونی لازمی تھی۔ گو سیاسی تقاریر سننے ضرور جاتا تھا اور گھر واپس آکر باہمی مباحثے اور تبصرے بھی ضرور ہوتے تھے مگر یہ ذہن میں نہ آیا کہ عملی سیاسیات میں حصہ لیا جائے۔ مولانا ظفر علی خاں کی مذہبی سیاسی تقاریر کئی بار سنیں۔ لالہ لاجپت رائے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی تقاریر بھی سنا کرتے تھے۔ قائد اعظم جب مسجد شہید گنج کے تصفیہ کے لئے لاہور آئے تو شاہی مسجد میں سلام پھیر کر دیکھا کہ میں قائد اعظم کے ایک جانب ہوں۔ قائد اعظمؒ نے رومی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ سلام پھیرتے ہی انھوں نے ٹوپی فوراً اتار دی۔ ان کے گھنے اور سفید بال جو پیچھے کی طرف کٹے ہوئے تھے مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہیں۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے ورنہ مقصد کہنے کا یہ نہیں کہ میں بھی کسی شمار میں تھا۔ خود قائد اعظمؒ اس وقت عملی سیاست میں اس قسم کی بحث میں نہ پڑے۔ البتہ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ جب کانگریس کی وزارتیں

بنیں اور انھوں نے سخت تعصب سے کام لینا شروع کیا تو مسلمانوں کو یہ بُری طرح احساس ہوا کہ اگر ہندوؤں کی حکومت سارے ہندوستان میں قائم ہوگئی تو مسلمان قوم کا حشر بُرا ہوگا۔ مجھے علم نہیں کہ کتنے لوگ مجھ سے اس بات پر متفق ہوں گے لیکن میں اپنی جگہ سو فی صد اس بات کا قائل ہوں کہ اگر یہ ہندو وزارتیں، یعنی کانگریس کی وزارتیں اپنے تعصب اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرتیں خصوصاً اقلیتی صوبوں میں تو مسلم لیگ کی تنظیم اتنی سرعت سے تقویت نہ پکڑتی۔ ہندوؤں میں یہ بات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ انہیں حکومت یا اقتدار مل جائے تو اس کا استعمال تنگ دلی اور تعصب سے کرتے ہیں۔ حالانکہ اقتدار ملنے کے بعد انسان کا نظریہ کئی مسائل میں بدل جاتا ہے اور بدلنا بھی چاہیے کیونکہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد حیثیت ہی دوسری ہو جاتی ہے۔ صاحبِ اقتدار کا فراخ دل ہونا ضروری ہے اور بلند نظریہ کا ہونا بھی اسی قدر لازمی ہے۔ ورنہ ایک جماعت کا اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی اگر پارٹی بازی کا خصوصی نقطۂ نظر ہو تو کئی معصوم لوگ اس کے ظلم و تشدد اور تعصب کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔ جن کی داد فریاد سننے کی ذمہ دار وہی جماعت ہوتی ہے اور ایسے حالات میں جب ایک انسان کو وسیع اختیار حاصل ہو جائیں جیسے کہ ایک ڈکٹیٹر کو حاصل ہو جاتے ہیں تو تعجب نہیں کہ اس کا مقصد کینہ پروری ہو جائے اور انسانیت کچھ عرصہ کے لئے دب کر رہ جائے بلکہ اچھی قدریں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان حیوان ہونے کا ثبوت دینے لگتا ہے۔ معصوم انسان شک اور سازش کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں تاریخ بعد میں اپنا بدلہ لیتی رہے جو معصوم لوگ اپنی جانیں تک دے چکے ہوتے ہیں۔ ان کی بلا سے اگر تاریخ نے کسی چنگیز یا ہلاکو خاں سے بدلا لیا ہو دنیا کے حالات

کا تقاضا ہے کہ ایک نہج پر نہیں رہ سکتے۔ بلکہ یہ متواتر کروٹ بدلتے رہتے ہیں یہ محض دبے ہوئے مظلوم و معصوم انسانوں کے دلوں کے سہارے کی بات ہے کہ وہ تاریخ کا آسرا لیں۔

کانگریس کا کردار

ہندو کانگریس میں بڑے بڑے دانا اور زیرک انسانوں کے ہونے کے باوجود کانگریس کی حکومتوں نے تاریخی اور ناقابل تلافی غلطیاں کیں اور تنگ دل ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ جس نے مسلمان قوم کو چونکا دیا۔ کانگریس میں بھی کئی مسلمان تھے۔ بایں ہمہ کانگریس تنگ نظری پر عمل کرنے سے گریز نہ کر سکی۔ اسی پالیسی نے پاکستان کی تحریک کو صحیح طور پر جنم دیا۔ پھر اسی پالیسی نے پاکستان کی تحریک کو تقویت دی۔ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھا انہی صوبوں میں ایسے حالات بھی پیدا ہوئے کہ پاکستان کی تحریک مضبوطی پکڑ گئی اور ان ہی لوگوں نے بڑی بڑی قربانیاں بھی دیں۔ ان سب حالات کی ذمہ داری کلیتہً کانگریس پارٹی پر تھی جسے ۱۹۳۷ سے ۱۹۳۹ء تک اقتدار سونپا گیا تھا۔

دوسری اس قسم کی تاریخی غلطی جو کانگریس جماعت سے ان کے نقطہ نظر سے سرزد ہوئی وہ مشن تجویز کو ٹھکرانا تھا۔ جس میں ہندوستان کی حیثیت ایک ہی رکھی گئی تھی۔ میری دانست میں اس دور میں کانگریس کی لیڈرشپ کے لئے نازک ترین امتحان تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ اس نازک دور میں کانگریس کے لیڈروں سے غلط فیصلہ ہوا مگر قائداعظم کی فراست کی داد دیے بغیر دشمن بھی نہیں رہ سکتا کہ اس وقت انھوں نے پتوں کو ایسا کھیلا کہ ایک

گیا ہوا کیس پھر اپنے ہاتھ میں آگیا۔ اس فیصلے کا پس منظر بھی وہی تنگ دلی اور تنگ نظری تھی جس کے پیچھے محض کانگریس کی تجارت تھی۔ سیاست، فراست اور سیاسی بلندی کا مظاہرہ ہندوؤں سے قطعاً نہ ہو سکا۔ آپ غور کریں کہ اگر ہندوستان کی فوج کی تقسیم عمل میں نہ آتی تو مسلمانوں کی مشترک ہندوستان میں کیا حیثیت ہوتی۔ دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ حکومت کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کے استعفے دے کر نکل جانے اور ماسوائے ہندو حکومت کے خلاف بغاوت کے کیا چارہ رہ جاتا جب کہ فوج ان کے ہاتھ میں ہوتی تو بغاوت کیا معنی رکھ سکتی تھی۔ کہتے ہیں قائدِ اعظمؒ نے ایک دور میں فرمایا تھا۔

"مجھے اپنی فوج اور سندھ کا صحرا دے دو میں اس کا نام پاکستان رکھ لوں گا"

یہ دور اندیشی اور تاریخی نظر کی بہترین مثال مجھے دکھائی دیتی ہے۔ بڑے انسان کا صحیح اور نازک امتحان مناسب موقعوں پر ہوتا ہے اور معمولی سی غلطی ہونے سے تاریخ سو سال کا چکر کاٹ کر پھر واقعات کو دہراتی ہے۔ تاریخ ہر دوسرے دن واقعات نہیں دہراتی بلکہ تغافل اور کوتاہی کے غلط فیصلوں پر در گزر کرتی ہے۔

پہاڑ۔ مسافر اور بغاوت

حبیب اور میں تھرڈ ایئر کلاس میں داخلہ لینے کے لئے لاہور گئے تو ان دنوں راستے میں آزاد پتن کا پل ٹوٹ گیا ہوا تھا۔ جسے اس وقت پھمن پتن کہا کرتے تھے۔ یہ پل بھی "نازک مزاج" واقع ہوا تھا جو بارشوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا حالانکہ آنے جانے کا راستہ یہی تھا۔ راولپنڈی ٹرین سے اتر کر

لاری سے کھوٹہ اور کھوٹہ سے آزاد پتن اور پھر راولاکوٹ جانا ہوتا تھا۔ پُل ٹوٹ جانے سے ہمیں کوہالہ والا سفر اختیار کرنا پڑا۔ کوہالہ سے چل کر دو تین میل سفر طے کیا ہوگا کہ شام ہوگئی۔ رات کو چلنا بھی خطرناک تھا۔ ہم نے چاہا کہ کسی کے گھر قیام ہو جائے۔ ہم نے بہت کوشش کی۔ راستہ کے قریب رہنے والے لوگ مسافروں کی روزانہ کی کوفت سے اکتا چکے تھے، آخر کہاں تک روز روز کی مہمان نوازی کی جاسکتی ہے یا مہمان نوازی کی ایک حد ہوتی ہے۔ چنانچہ کوہالہ سے لے کر پونچھ شہر تک میں نے کئی بار پیدل سفر کیا۔ اس سارے راستہ میں غریب آدمی کو رات گزارنے کے لئے جگہ ملنا ایک بڑی مشکل بات ہوتی تھی۔

ہم نے کوشش کی مگر ناکام ہوئے حالانکہ یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ دو میل آگے جاسکتے تو ہمارے اپنے دوستوں کے گھر چھباڑی گاؤں میں تھے مگر دو میل سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ چار و ناچار ایک کھلے برآمدے میں ڈیرے ڈال دیے۔ ہمارے پاس بستر نہ تھا نہ کچھ اور۔ نہ ہی کھانا کھایا تھا دوسرے دو جو ساتھ تھے انھوں نے کچھ نہ کھایا تھا غلطی یہ ہوئی کہ کھانے کے لئے ساتھ بھی کچھ نہ لیا تھا۔ رات ہونے پر سردی پڑنے لگی اگرچہ یہ مئی جون کا مہینہ تھا مگر ان پہاڑیوں میں رات کو مئی جون میں بھی خاصی سردی پڑنے لگتی ہے۔ چھباڑی کے لگ بھگ کے جو پہاڑ ہیں اگر ۷، ۸ ہزار فٹ کی بلندی والے پہاڑ ہیں۔ ہم نے ساری رات جاگتے ہوئے کسمپرسی کی حالت میں گزاری جب بھی میں وہاں سے گزرتا ہوں مجھے وہ رات اسی طرح آنکھوں کے سامنے نظر آجاتی ہے۔

راولاکوٹ سے آگے پیدل سفر کوہالہ تک یا دوسری جانب سے کھوٹہ

تک بڑی کوفت کی بات ہوا کرتی تھی۔ مجھے اپنی نوعمری کی اگر کوئی تکلیف بسا اوقات یاد آتی ہے تو یہی سفر ہے۔ برفانی سفر اتنا مشکل نہیں، کئی بار پونچھ شہر سے چل کر راولاکوٹ تک ہم سفر کرتے رہے اور یہ ایک اچھا سفر تھا۔ سڑک بھی اچھی حالت میں ہوا کرتی تھی۔ گھوڑا سواری کا بھی انتظام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ اگر پلے پیسے ہوں تو مگر لاہور آنے جانے کا یہ پیدل سفر جو ہم برداشت کرتے تھے ایسا کٹھن تھا جو مضبوط ارادے والے انسان کو بھی خاصا پریشان کر دیتا تھا ہم اپنی پڑھائی کے اتنے دلدادہ تھے کہ اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کر لیتے تھے۔

جو لوگ ان سڑکوں پر سفر کرتے تھے اور سروں پر بوجھ اٹھا کر ان کی تکلیف کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ ساری پونچھ ریاست کا مغربی حصہ اپنی ساری زندگی کی ضروریات اسی راستہ سے مہیا کرتا تھا۔ سارا علاقہ فوج میں ملازمت کرتا تھا۔ ساری کمائی انگریزی علاقوں سے ہوتی جس سے ان پہاڑی لوگوں کی پرورش ہوتی تھی۔ راجہ پونچھ تو محض مالیہ لینے کا روادار ہی تھا اسے اپنے تحصیلدار اور تھانے دار ہم پر مسلط کرنے کا حق تھا۔ ورنہ عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی کام راجہ کی حکومت سے حسنِ اتفاق سے بھی نہ ہوتا تھا۔

اس علاقے کے لوگ ہر لحاظ سے پس ماندہ تھے۔ اقتصادی حالت یہ تھی کہ دو وقت کا کھانا بھی آسانی سے کسی کو نصیب نہ تھا۔ تعلیم دینا تو ڈوگرہ حکومت مسلمان عوام کو گناہ سمجھتی تھی کیونکہ تعلیم سے بغاوت پھیل سکتی تھی اور بغاوت ڈوگرہ کے لئے خطرہ کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی "صاحب" انگریزی علاقے سے سپاہی بھرتی کرنے اس علاقہ میں آیا کرتے تھے اور انہیں اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ یہ علاقہ کس قدر نظر انداز کیا گیا ہے!

ان حالات اور اس ماحول نے ان لوگوں کو سخت قسم کی جفاکشی سکھائی ہے۔

انگریز کی فوجوں میں بھرتی ہو کر ان لوگوں نے اپنے اندر نظم اور ضبط پیدا کیا۔ دور دراز کے علاقوں تک جا کر ان کی آنکھوں نے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو دیکھا اور بہت کچھ سیکھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں میرے گاؤں کے کئی لوگ فرانس اور یورپ کے دوسرے مقامات پر لڑ چکے تھے۔ ترکی میں تین چار سال تک کئی لوگوں نے قیدیں کاٹیں۔ ۱۹۵۵ء میں جب میں ترکی کے دورہ پر گیا تو مجھے اپنے ملک کا ایک آدمی ملا۔ جس کے خوب صورت بچے مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے وہ اسی زمانے میں ترکی میں رہ گیا تھا۔ استنبول میں مجھے ایک عورت ملی جو سری نگر کی رہنے والی تھی اس نے مجھے اپنا پورا شجرۂ نسب دکھایا جو اس نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور پاکستانی سفارت خانہ سے کچھ خط و کتابت کر رہی تھی۔

آج بھی ہمارے لوگ دور دور تک جاتے ہیں بلکہ گھر سے باہر جانے میں ایک بچہ بھی اب جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ہر نوجوان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ باہر جا کر دوسرے ملک اور دوسری جگہیں دیکھے۔ چنانچہ کوئی نوجوان شادی کرنے کے لائق اپنے آپ کو خیال نہیں کرتا جب تک کہ اس نے باہر جا کر دس بارہ سال نوکری نہ کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لوگ بڑے گھٹیا زمیندار بنتے ہیں مگر بہترین سپاہی بڑی آسانی سے بن جاتے ہیں۔ سپاہی ان کا آبائی کام ہے۔ زمینداری سے جی کتراتے ہیں۔ آج بھی ہمارے ملک میں محنت اور جفاکشی سے زمین کا کام لیا جائے تو یہی سرزمین وطن میں بہترین سیب اگا سکتی ہے۔ انگور کے باغ لگ سکتے ہیں۔ آڑو۔ ناشپاتی بگوگوشہ بہترین قسم کا پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میری دانست میں سارے پاکستان میں بہترین آب و ہوا اگر کسی مقام کی ہے تو مری کے ساتھ ساتھ جو علاقہ آزاد کشمیر

کہا جاتا ہے اس کی ہے۔ خدا جانے کیوں ان لوگوں کو سرزمین سے الفت کم ہے حالانکہ ایک مرلہ زمین پر اگر ایک دوسرے سے الجھ پڑیں تو ممکن ہے برسوں مقدمہ چلتا رہے اور ہزاروں روپے باہر سے لاکر اس مقدمہ پر خروچ کردیں۔

ان علاقوں کے لوگ جفاکشی اور جوانمردی میں دنیا کے کسی بھی حصے کے لوگوں سے کم نہیں ہیں مگران کی صحیح راہنمائی اور صحیح راستہ دکھانے کی ضرورت ہے۔ اب پاکستان بننے کے بعد یہ دونوں سڑکیں (کوہالہ والی اور آزادپتن والی) بن گئی ہیں لہذا اس علاقہ میں اقتصادی اور سوشل حالات بدلنے کی بڑی توقع ہے۔ بڑی سرعت کے ساتھ حالات بدل بھی رہے ہیں بڑے بڑے کالجوں میں یہاں کے نوجوان تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں لاہور کے کالجوں میں جاکر یہاں کی لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس علاقے میں (۱۹۴۷ء کے حالات سے توازن کرتے ہوئے) موجودہ ترقی جس سرعت سے ہورہی ہے۔ انقلاب سے کم نہیں ہے۔ یہ محض اقتصادی۔ سوشل اور پولیٹیکل انقلاب نہیں ہے بلکہ انسانوں کے خیالات میں ایک انقلاب رونما ہورہا ہے۔ ان کے طرزِ زندگی میں ایک نئی لہر پیدا ہورہی ہے۔ ان لوگوں کے خیالات کے افق اب بدلتے جا رہے ہیں اور میرے خیال میں ان تغیر پذیر رجحانات کی صحیح رہنمائی نہایت ہی ضروری ہے۔ صحیح قسم کی تعمیری رہنمائی جوان لوگوں کو صحیح اقتصادی تعمیر کی جانب لے جائے۔ کھلی قسم کی سیاست جس میں تعمیر کارگر نہ ہو ان لوگوں کے لئے نہایت ہی خطرناک ثابت ہوسکتی کیونکہ ان کے خیالات میں ابھی تک سطحی پیدا ہونے میں سالہا سال لگ جائیں گے اور پختگی سے

پہلے جو بھی انقلابی اقدام ہو گا وہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ جوان لوگوں کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ ابھی تک یہ علاقہ محض سلامتی کونسل کے بین الاقوامی تقاضوں میں الجھ کر رہ گیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ دیر تک اسی قسم کے حالات یہاں رہے اور ہنگامی حالات کا خاتمہ نہ کیا گیا تو دشمن کو جب بھی موقعہ ملے گا ان لوگوں کو خراب کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔

موسم بہار اور امتحانات

۱۹۳۷ء کے موسم بہار میں ہم نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ خدا جانے یونیورسٹی والے اس موسم میں امتحان کیوں رکھتے ہیں؟ یہ ایسا موسم ہوتا ہے جبکہ لاہور کا ماحول پر لطف ہونے کے علاوہ انقلاب انگیز ہوتا ہے۔ اس موسم میں نوجوانوں کو امتحان کے دھندوں میں پھنسا دینا میری دانست میں ظلم سے کم نہیں ہے! امتحان کے لئے کوئی اور موسم چننا چاہیئے۔ جیسے دسمبر کا مہینہ یا نومبر کا مہینہ کاش کہ اس کا احساس انہیں ہو جائے جو ان احکامات کے بدلنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

ہمارا نتیجہ کہیں جا کر اگست میں نکلا کرتا تھا لہٰذا امتحان کے بعد ہم نے لاہور کو الوداع کہی اور اپنے گھروں کو ہو لئے۔ چار سال کی لمبی لمبی دوستیاں ایک لمحے میں ختم ہو گئیں۔ جزو تاریخ بن گئیں۔ وہ دن کہاں روز روز نصیب ہوتے ہیں جب چڑھتی ہوئی جوانیاں ہوں۔ انسانی دماغ میں خیالات انقلاب کی طرح اٹھتے ہوں اور خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ارادے اس دور میں باندھے جاتے ہیں مگر جب زندگی کی کشمکش میں انسان داخل ہوتا ہے تو خیالوں کی رومانی دنیا پاش پاش ہو کر رہ جاتی ہے اور زندگی

کا حقیقی پہلو سختی سے سامنے آجاتا ہے۔

برادرِ بزرگ ۔ متاعِ عزیز

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ جیب سے کبھی میں نے ذکر کیا یا نہیں مگر محبوب سے میں نے رضائی میں بیٹھ کر کئی بار کہا کہ ولایت جانا چاہیئے اور باقی تعلیم وہیں مکمل ہونی چاہیئے۔ انگریزی کے ناولوں سے جو میں نے حتی الامکان سب ہی پڑھ ڈالے ہوں گے اپنی جگہ یہ گہرا اور خوشگوار تاثر میں نے لیا کہ بس انگلینڈ ہی ایک ایسا ملک ہو سکتا ہے جہاں دنیا کی ہر چیز مل سکتی ہے اور آسانی کے ساتھ! وہاں عورتوں اور حسیناؤں کے ساتھ تعارف میں بہت تھوڑی سی دیر لگتی ہے اور جوں ہی یہ ہوا بس آپ رومان کی دنیا کے بادشاہ ہو گئے مگر یہ تاثر غیر حقیقی تھا۔ خوش فہمی کے سوا اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ ہندوستان میں بڑے تکلفات ہیں۔ ہزاروں رسمیں ہیں جو انسانی تخیل کو آزادی کے ساتھ پرواز کا موقعہ کبھی دے ہی نہیں سکتیں! شاید ہر انسان کے تخیلات کی دنیا کا پس منظر ایک عورت ہوتی ہے! جسے وہ ملکہ بنانا چاہتا ہے اور ایسی مملکت کی جہاں اور کسی کے ساتھ اشتراک نہ ہو یا ہر نوجوان کی زندگی، اس کے عمل اور اس کی جدوجہد کے پس منظر ایک عورت ضرور ہوتی ہے خواہ وہ خیالی ہو یا حقیقی! یہ فطرت کا اٹل تقاضا ہے اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اس معاملہ کی تصدیق کے لیے کسی تاریخ کے ورق الٹنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی نوجوان میں یہ نہیں ہے تو اس نوجوان کے انسان ہونے میں کچھ خلل ضرور ہے۔

انگلینڈ جانے کا پروگرام بنا کر اس کی تکمیل تو میرے بس کی بات نہ ہو سکی

تھی ۔ میرے بھائی اسماعیل خاں نے میری تعلیم کے سلسلہ میں بڑی امداد کی
ہوئی ہے ۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے بھی الگ ایک کتاب کی
ضرورت پڑتی ہے ۔ میرے بچپن سے لے کر آج تک اس بھائی کی جتنی
میرے ساتھ اور پھر آج کل میرے بچوں کے ساتھ خلوص اور محبت ہے
اس کی مثال اپنی جگہ کم ہی مل سکتی ہے ۔ چنانچہ جب وہ مجھے لاہور سے لینے
کیلئے آئے تو ان سے میں نے مشورہ کیا کہ بی ۔ اے کے بعد میں کیا
کرنا چاہیئے ۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے تو میں نے انہیں بتایا
کہ میں قانون کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر میں نے اصل بات انہیں ابھی
نہ بتائی ۔ کیونکہ سارا پروگرام ایک دم بتا دینے سے اس کے ناکام ہو جانے
کے امکانات زیادہ تھے ۔ میرے والد یا میرے بھائی اتنے امیر تو تھے
ہی نہیں کہ بیس ہزار روپے کے لگ بھگ خرچ کر سکیں ۔ اس قسم کا پروگرام
محض خیالی پلاؤ تھا ۔ ہم یقیناً اس دور میں کچھ کاروبار کر کے اچھے دن گزار
رہے تھے ۔ زمین ہمارے پاس کافی تھی ۔ علاقہ میں لوگ عزت بھی کرتے
تھے مگر ولایت کا پروگرام سب کے لئے حیران کن ہی نہیں بلکہ پریشان کن
بھی تھا اور اس ساری سکیم کی تکمیل کے لئے اسی میرے عزیز بھائی نے
میرا ساتھ دیا ۔ میں حیران ہوں کہ اس بھائی کی ہمت اور عظمت کتنی بلند
ہے ۔ وہ اتنے پڑھے لکھے نہیں جتنے کہ میرے بڑے بھائی ہیں اور یہ لکھے پڑھے
ہوتے تو میرے خیال میں یہ ہم سب سے آگے جا نکلتے مگر انہیں وہ موقعے
حاصل نہ آسکے جو مجھے ان سب کی محنتوں ، محبتوں اور کوششوں سے حاصل
ہو گئے ۔ کچھ عرصہ فوج میں نوکری کی ۔ واپس آئے اور کاروبار شروع کیا ۔ کاروبار
میں وہ سب سے زیادہ سمجھ رکھتے ہیں ۔ ہم سب سے ہمدردی انہی کو ہے

سب بہنوں کے نزدیک تر ہی ہیں اور یہ کتنی اچھی بات ہے ۔ میری ماں نے
آخری ایام میں میرے اس بھائی کو اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا اور پھر جب
میرے والد جب فوت ہوئے تو اس بھائی کے لئے فکر و تشویش کا معمولی سا
اظہار کیا کہ اکیلا کیسے کام بنھائے گا کیونکہ میں اس وقت پڑھنے ولایت
چلا گیا تھا۔

تاہم میں اور میرے اس غیور بھائی نے مل کر سارے معاملے کو ٹھنڈے
دل سے سوچا پھر ایک اٹل فیصلہ کیا ۔ اس کی تکمیل کے لئے پوری کوشش
کی اور سو فیصد کامیاب ہوئے ۔ اس کامیابی پر کئی لوگ حیران بھی تھے آخر کامیاب
کیسے ہوئے مگر سارے لوگ خوش ہوتے ہم بھی کچھ روپیہ خرچ کیلئے تیار
ہو چکے تھے مگر بیس ہزار روپے یکدم خرچ کرنا ہمارے بس کا روگ نہ تھا
اس بیس ہزار کی بھی ایک کہانی تھی ۔ شروع ہی میں لاہور کے ایک کم بخت
بیرسٹر صاحب نے ہماری غلط رہنمائی کی ۔ اس نے کہا کہ بیس ہزار نقد اپنے
پاس ہونے چاہئیں تب ہی ولایت جا کر پڑھائی ہو سکتی ہے ۔ اس لئے ہم نے
اپنا نصب العین نقد بیس ہزار سامنے رکھ دیے جو محض غلطی تھی ۔ ہو سکتا تھا
کہ اس بیس ہزار کے چکر میں ساری سکیم ہی ناکام ہو کر رہ جاتی ۔

میں نے تجویز یہ سوچی کہ حکومت پونچھ کچھ وظیفہ دے دے تو باقی
انتظام ہو جائے گا ۔ سکیم بڑی معقول تھی اور معلوم نہ تھا کہ وظیفے کا حصول ہندو
حکومت سے کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔ ہندو حکومت کو میری تعلیم اور پھر
ولایت بھیج کر قانون کی تعلیم سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ؟ پونچھ کا وزیر اعظم ایک
کشمیر دربار کا بھیجا ہوا افسر ہوا کرتا تھا ۔ وہ زیادہ تر راجہ صاحب پر سی آئی ڈی
کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا ۔ علاقہ پونچھ کا نظم و نسق بھی اسی کے سپرد

ہُوا کرتا تھا۔ ہر ضروری اور اہم معاملہ میں راجہ صاحب پونچھ سے مشورہ لینا بھی ضروری ہوتا تھا۔ اس لئے جہاں کہ وزیر پونچھ یہ کام تھا کہ راجہ صاحب پونچھ کے ہر عمل کی سی آئی ڈی کرے وہاں علاقے کا نظم ونسق بھی اُسی کے ذمے تھا۔ بڑے جابر اور فرعون لوگ بھی آتے رہے ہیں جن کی احمقانہ پالیسیوں کی وجہ سے علاقہ میں بدنظمی پھیلتی رہتی تھی۔ ریاست کشمیر کی ایڈمنسٹریشن کے نکتہ نگاہ سے پونچھ ہی مشکل ترین علاقہ خیال کیا جاتا تھا۔ بالآخر یہیں سے ۱۹۴۷ء میں بغاوت ہوئی اور انجام کار انقلاب کی صورت اختیار کر گئی۔

مہاراجہ پونچھ

میری خوش قسمتی ہی خیال کیجئے کہ اس دور میں وزیر فیروز پور چند پونچھ کے وزیرِ اعظم تھے۔ یہ آزاد خیال اور فراخ دل ہندوؤں میں سے تھے۔ اس قدر متعصب بھی نہ تھے نہ ہی تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ہم لوگ ایک وفد کی صورت میں جاکر راجہ صاحب پونچھ سے ملے۔ ان کے سامنے سارا معاملہ رکھا۔ ایسے لوگ بھی اس وفد میں تھے جو راجہ صاحب کی مخالفت کر چکے تھے وہ ان لوگوں کو دیکھ خوش ہوئے کہ مخالف لوگ بھی انہیں ملنے آئے تھے۔ سارا معاملہ جب راجہ صاحب کے سامنے رکھا گیا تو انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اہلِ وفد نے انہیں بتایا کہ پونچھ کے نوجوان پڑھے لکھے ہو جائیں گے تو کشمیر دربار سے افسروں کے لانے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ یہ راجہ صاحب کے دل لگتی بات تھی لہٰذا انہوں نے بڑی پسند کی پھر ساری ترکیب خود بتائی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے وزیر صاحب کے پاس جاؤ ان سے کچھ تھوڑا سا معاملہ منواؤ باقی سارا معاملہ میں خود طے کر

دوں گا ۔ باہمی اختلاف رائے کی صورت میں سارا معاملہ ختم ہو جائے گا ۔ انہوں نے یہ بھی ازراہ ہمدردی سمجھایا کہ وہ خود اوپر سے لکھ کر وزیر صاحب کو حکم بھیجیں گے تو وزیر صاحب لیت و لعل کر کے ٹال دیں گے ۔ یہ ہمدردی کے علاوہ دانائی کی گفتگو تھی ۔ ہم سب ہی وفد والوں نے ان کا شکریہ ادا کیا ۔

دو دن کے بعد وفد وزیر فیروز چند کو ملا انہوں نے اس معاملہ پر بڑی لمبی بحث کی ۔ ہم اپنی بات پر اڑے رہے ۔ بالآخر نیم خواستہ انہوں نے بھی ہاں کر دی ۔ تفاصیل کا ہمیں علم نہ تھا ۔ ہمیں لاعلمی اور ان معاملات کی ناواقفیت کی وجہ سے یہ خوش فہمی ہوئی کہ بس وظیفہ منظور ہو گیا مگر جلد ہی ہماری یہ غلط فہمی دور ہو گئی ۔ ہمیں پورے ایک سال تک کئی چکر لگانے پڑے ۔ یہ چکر راولاکوٹ سے پونچھ ، پونچھ سے لاہور لگانے پڑے راجہ صاحب پونچھ سردیاں گزارنے لاہور چلے جایا کرتے تھے ۔ ان چکروں میں سب سے بڑی کوفت میرے والد صاحب کو ہوئی ۔ جو تکالیف ان کو اٹھانی پڑیں ان کی تفاصیل یہاں بیان نہیں ہو سکتیں ۔ ان کی طبیعت بڑی تیز اور حساس تھی اس وجہ سے بھی جب دفتروں کے چکر کاٹنے پڑے اور چھوٹے کلرک سے لے کر بڑے افسر کے دفتر کے چکر کاٹنے پڑے تو ان کی طبیعت بے حد پریشان ہوئی اور بھی کئی اصحاب تھے جن کا تفصیلی ذکر محض معمولی بات کو طول دینا ہے مگر میرے عزیز بھائی سردار اسمٰعیل خاں نے سب سے زیادہ تکلیف میرے وظیفہ کے معاملہ میں اٹھائی ۔ جب انجام کار میرے پاسپورٹ کے کاغذات سری نگر ریذیڈنسی چلے گئے تو وہاں سے کوئی خبر نہ ملتی تھی ۔ جنوری فروری کے مہینوں میں بھائی اسمٰعیل خاں براستہ اوڑی پونچھ ہوتے ہوئے سری نگر گئے ۔ اس وقت پونچھ سے اوڑی تک کوئی لاری کی سڑک نہ تھی اور اوڑی اور پونچھ کے درمیانی پہاڑوں پر کم و بیش تین چار گز برف پڑی ہوتی ہے ۔

جب دوسری نگر پہنچے تو انہیں علم ہوا کہ ریذیڈنسی سردیوں میں سیالکوٹ میں چلی جاتی ہے پہلے علم ہوتا تو اس قدر خطرہ مول لینے کی ضرورت کیا تھی۔ زندگی میں بعض اوقات اپنی لاعلمی کی وجہ سے انسان کو ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو غیر ضروری ہوتے ہیں اور محض صحیح بات سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی اپنے ہی طریقہ سے سبق سکھاتی ہے مگر اس کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔ زندگی کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد ہی انسان دانا بنتے ہیں بعض اوقات تلخ تجربہ ہی انسان کو دانا بنا سکتا ہے۔ جب تک علم کو تجربہ کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاتا تب تک علم کا ہونا بے معنی ہے۔

جب سارا معاملہ طے ہو گیا تو ہمیں قرضہ بھی ضرورت کے مطابق مل گیا اور میں نے پورے چار سال کے عرصہ میں ولایت میں صرف ۱۰ ہزار روپے صرف کئے اور ایل ایل۔ بی کی ڈگری لندن کی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بار ایٹ لاء کی ڈگری بھی حاصل کرلی اور اگر جنگی گرانی نہ ہوتی تو میں اس سے بھی تھوڑی رقم میں اپنی تعلیم مکمل کر لیتا۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ میں محض کتابوں کا کیڑا ہی نہیں تھا بلکہ ولایت میں رہ کر ہر وہ تجربہ حاصل کیا جس سے انسان کی زندگی میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے۔ زندگی کے ہر تجربے سے مستفید ہوا جو طالبعلم کی حیثیت میں میرے لئے جائز سمجھی جا سکتی تھی۔

حصہ سوئم

وحشت فرنگ

میں اوائل ۱۹۳۶ء میں اپنی تعلیم سے فارغ ہو گیا اور ولایت جانے کی تیاری ہونے لگی ۔ بہت کم لوگوں کو گاؤں میں یقین تھا کہ ہمیں اس معاملہ میں کامیابی حاصل ہو گی مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہو گیا ۔ میری کامیابی کے بعد اور لوگ بھی جا کر حکومت پونچھ کے پیچھے پڑے مگر کامیابی کسی کو نہ ہوئی ۔ اس لئے نہیں کہ یہ ناممکنات والی بات تھی بلکہ اس لئے کہ جس استقلال اور مستعدی سے میں نے اس معاملے کا پیچھا کیا تھا اور کسی نے نہ کیا ۔ جب میرے بھائی اور میں اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے تو ہمارے پاس کوئی چھ سات ہزار روپیہ نوٹوں کی صورت میں تھا ۔ ایک سراغ رساں نے ہمیں خبر دی کہ آپ کو راستہ میں لوٹ لیا جائے گا ۔ راولاکوٹ سے کوہاٹہ تک سخت دشوار گزار راستہ ۵۰ میل کے لگ بھگ پڑتا ہے ۔ یہاں ڈاکے بھی عام پڑتے تھے ۔ بہر حال میں اور میرا بھائی اسماعیل خاں روانہ ہو گئے کچھ اور صاحب بھی ساتھ تھے ، حوصلہ بلند تھا ۔ راستہ میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا ۔ البتہ جن لوگوں کے متعلق ہمیں کہا گیا تھا کہ وہ ڈاکہ ڈالیں گے ۔ وہ راستہ میں ضرور ہمیں ملے ۔ بلکہ کافی راستہ ہمارے ساتھ رہے رات ہم ایسی جگہ ٹھہرے جہاں لوٹ مار کا سوال پیدا نہ ہو سکتا تھا اور دن کو ایسی جرأت کرنے والے وہ لوگ تھے ہی نہ ۔

اس زمانے میں انگلستان کی کرنسی حاصل کرنے کے جھگڑے نہیں تھے۔
ہم نے لائیڈز بنک لاہور میں پیسے جمع کروائے تو فوراً روپیہ ولایت منتقل ہو گیا۔
یہ کتنی سہولت کی بات تھی جبکہ تمام موجودہ دقتیں جنگِ عظیم کے بعد کی پیداوار ہیں۔
بھائی صاحب میرے ساتھ بمبئی تک گئے۔ وہاں سے مجھے سمندری جہاز
"ایس ایس کونٹی راسو" پر سوار کیا۔ یہ بڑا جہاز تھا۔ اٹلی کی ایک کمپنی کا تھا اور جنگِ
عظیم میں اس جہاز کے ڈوبنے کی خبر ریڈیو پر سن کر مجھے افسوس ہوا۔۔۔۔!!!

جہاز کا سفر

جہاز کے کمرے میں میرے اور ساتھی چین کے باشندے تھے
وہ انگریزی زبان سے بالکل بے بہرہ تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں
ناک کے ذریعے باتیں کرتے ہیں ان کی باتوں کا میرے پلے کچھ نہ پڑتا تھا
میرے ساتھ ان کی معمولی سی باتیں اشاروں سے ہوتی تھیں۔ پہلی رات
بڑے آرام سے گزری۔ صبح سورج چمکتا ہوا نکلا۔ صبح خوب صورت تھی میں
فوراً تیار ہو کر اوپر ڈیک پر چلا گیا۔ سمندر چاروں طرف خوب صورت اور نیلگوں
تھا۔ ملک ملک کے اور طرح طرح کے لوگ تھے۔ ہندوستانی۔ ایرانی۔
جاپانی، انگریز اور یورپین سب قسم کی عورتیں تھیں۔ عورتیں عجب مخلوق ہوتی
ہیں۔ ایک دوسرے پر فوراً تنقیدی نگاہ ڈالتی ہیں اور ایک ہی نظر میں دوسری
عورتوں کے متعلق اچھی بُری رائے قائم ہو جاتی ہے۔ پہلا موقعہ ملنے پر اس
رائے کا اظہار الفاظ میں ہو جاتا ہے۔ عورتیں عموماً تنگ دل ہوتی ہیں۔
دوسری عورت کی خوبی۔ خوب صورتی یا لباس کی خوبصورتی کا اعتراف جلدی
نہیں کر سکتیں اور تنقید کرنے میں دیر نہیں لگاتیں۔ ہمارے ساتھ بنگال

کی رہنے والی ایک لڑکی تھی۔ ولایت غالباً پڑھنے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے ایسا کوئی انسان نہ دیکھا تھا اسے دیکھ کر میں تو کچھ حیران رہ گیا۔ یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ باہر کے ملکوں والے ہم ہندوستان والوں کے متعلق ایسے انسانوں کو دیکھ کر کیا رائے قائم کریں گے؟ مجھے خواہ مخواہ اسے دیکھ کر پسینہ آ گیا۔ وہاں اور بھی ہندوستان کے لوگ سوار تھے مگر میں غالباً احساس واقع ہوا تھا ابھی تک ان معاملوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ لہٰذا یہ اثر ہوا مگر بعد میں جب اس دوشیزہ سے میرا تعارف ہوا تو گفتگو کرنے پر معلوم ہوا وہ بڑی اچھی ہیں۔ نہایت ہی پیار سے بات کرتی ہیں اسے اپنی اس بدصورتی کا اگر کوئی احساس تھا تو وہ اسے ہرگز دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔

جہاز پر ایک آرٹسٹ صاحب ہمارے ساتھ تھے وہ پنسل سے سب کے سکیچ کھینچ رہے تھے۔ جب انہوں نے اس صاحبزادی کا سکیچ بنایا تھا اس کی آنکھیں ایک چھوٹے سے چہرے پر دو چکتے ہوئے پتھروں کی طرح دکھائی تھیں ہم سب کو بڑا محسوس ہوا مگر وہ صاحبزادی ہنسی اور کہنے لگی کہ اچھا سکیچ ہے! یعنی یہ آرٹسٹ کا نکتہ نگاہ ہے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر یہ آرٹسٹ میرے ساتھ ایسے کرتا تو خدا جانے میں اس کے ساتھ کس طرح الجھ پڑتا مگر مجھ میں آرٹسٹ کی متوجہ کرنے والی چیز ہی کیا تھی!

جب جہاز نے دوسرے دن چلنا شروع کیا تو مجھے پتہ لگا کہ اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ایسی طبیعت متلائی اور اس قدر قے ہوئی کہ اپنے بستر پر جا کر نیم مردہ ہو کر پڑ گیا۔ جب اُٹھ کر باہر جانے کا خیال کرتا تو بس قے آنے لگتی۔ قے آنے کے ڈر سے میں اپنے بستر پر پڑا رہتا۔ تین چار

روز جب بستر پر پڑا رہا تو ایک دوست (جو جہاز پر ہی واقف بنے تھے) میری طبیعت پرسی کے لئے تشریف لائے، مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ "تم بڑے بزدل ہو، ایسے کب تک پڑے رہو گے۔ ارے بھائی جہاز پر ہی تو بڑے مزے ہوتے ہیں۔ تم بیمار بن جاؤ گے تو یورپ جانے کا فائدہ کیا"

میں نے اسے اپنی دردناک کہانی سنائی۔ اس نے کہا بھائی اس کا علاج یہی ہے کہ خوب قے کئے جاؤ۔ جب اچھی طرح قے ہو جائیں گے تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بہرحال نسخہ جس طرح کہ دوست نے فرمایا آسان معلوم ہوتا تھا پر ہمت کس کو تھی کہ اس نسخہ کو عملی جامہ پہنائے۔ بہرحال چارہ کیا تھا۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ولایت کا سارا اشتیاق اسی چکر میں ختم ہو جائے گا اور میں یہاں جہاز پر ہی دم دے دوں گا۔ میرے دوست نے میری بہتیری حوصلہ افزائی کی۔ ایسے ایسے رومانی تصورات اور پر ڈیک پر کے کھینچے کہ آخر مجھے احساس ہوا میں جو کچھ کھو رہا ہوں شاید وہ دوبارہ حاصل نہ ہو سکے میں نے ہمت باندھی اور اٹھ کر خوب ٹہلنا شروع کیا۔ جب قے آئے خوب قے کرتا گیا۔ حتیٰ کہ قے میں خون آنے لگا۔ تب جا کر میری طبیعت بحال ہوئی۔ اس وقت دس دن سفر کے گزر چکے تھے اور صرف چار پانچ روز کا سفر باقی رہ گیا تھا۔

تجربہ سب کچھ سکھا دیتا ہے

جب ہمارا جہاز جا کر وینس کی بندرگاہ پر لگا ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی سامان اتار کر ایک ریلوے سٹیشن پر رکھا۔ ہم لوگ سیر کو شہر کی جانب نکل گئے وقت تھوڑا ہی تھا۔ جب میں واپس آیا تو میرا سامان (جو تین سوٹ کیسوں پر

مشتمل تھا وہاں تھا ہی نہیں۔ میرے پاس ٹکٹ تھے مگر سٹیشن کے کمرے میں ایک بڑا سا بوڑھا اٹیلین تھا۔ وہ میری بات کچھ ہی نہ سکے۔ ۱۰ منٹ میں ٹرین پیرس کی طرف چھوٹنے والی تھی۔ ایک ٹرین روم جا رہی تھی۔ کچھ لوگ روم جا رہے تھے مگر میں سیدھا پیرس جا رہا تھا۔ اور پیرس سے آگے انگلینڈ جانا تھا۔ بے حد پریشانی ہوئی۔ سبھی لوگ جا چکے تھے مجھے اتنی ہوش رہی کہ فوراً جا کر روم والی گاڑی پر تلاش کرنے لگا۔ جہاں کچھ میرے ساتھی نظر آ گئے۔ ان کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ میرے سوٹ کیس وہ لے آئے ہوئے ہیں۔ اگر آج کی طرح ہوشیار ہوتا تو یقیناً انہیں پولیس تک پہنچاتا مگر اس وقت میں اللہ کا شکر بجا لایا۔ جگہ مل جاتی تو شکرانے کے دو سجدے بھی ادا کرتا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں پریشان ہو گیا تھا۔ سوٹ کیسوں میں کپڑوں کے علاوہ میرا پاسپورٹ وغیرہ اور باقی سب کاغذات تھے۔ جب دوسرے ملک میں پہلی دفعہ آدمی جائے تو پریشان ہونا بڑی معمولی بات ہوتی ہے۔ تجربہ ڈھیرے سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ تجربہ ہی سب سے اچھا استاد ہے۔ تجربہ وقت کے ساتھ ہوتا ہے —— فوراً حاصل نہیں ہو سکتا۔

راستے میں گاڑی پر سوار ہو کر میرے ساتھ ایک اور صاحب ہو گئے جو جہاز پر میرے واقف نہ تھے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ ان سے گفتگو پر معلوم ہوا کہ وہ کہیں درزی کا کام سیکھنے ولایت جا رہے ہیں۔ انگریزی وغیرہ سے بالکل بے بہرہ تھے۔ معمولی بات کر سکتے تھے۔ میں نے ان صاحب کی حوصلہ افزائی اور مکمل رہنمائی شروع کر دی۔ وہ ہمدردی سے بڑے خوش ہوئے اور انہیں تسلی ہوئی کہ ایک ولایت کا ساتھی مل گیا۔

جب گاڑی چل پڑی تو ہمیں بھوک کا احساس ہوا۔ یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ کھانے کے لئے کچھ ساتھ لے لیں۔ اگلا سٹیشن کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد آیا۔ وہاں ایک لفافے میں انہوں نے ہمیں کھانے کے لئے بنے بنائے لنچ سے دے دیئے۔ قیمت اتنی نہ لی۔ اس میں میرے خیال میں کچھ بند، کچھ سینڈوچ ایک بوتل بیئر کی رکھی ہوئی تھی۔ ہم نے کھانا کھانا شروع کیا۔ بند وغیرہ تو کھا گئے مگر بیئر کی بوتل سے ہم نے پرہیز کی۔ سچ تو یہ ہے کہ بیئر کی بوتل دیکھ کر میں اس قدر پریشان ہوا کہ میں یہ بات سوچ ہی نہ سکا کہ میں اسے کیا کروں۔ جیسے چپکے بیٹھے ہوئے آپ کی گود میں ایک سانپ کا بچہ چھت سے گر پڑے میری عجب کیفیت ہوئی اور نہ ہمارے ساتھ والے مسافروں کو بھی اس کا کچھ احساس ہوا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ قصہ کیا ہے۔ بہر حال میں نے بادلِ نخواستہ اس بوتل کو ہاتھ میں پکڑا اور گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ تمام گاڑی کے مسافر حیران ہو گئے کہ یہ کیسا انسان ہے جو اس بوتل کو اس بے دردی سے باہر پھینک رہا ہے۔

لندن میں

وینس سے چل کر پیرس پہنچے راستے میں کئی گاڑیاں تبدیل کیں مگر پیرس پہنچ کر ہوش ہی قائم نہ تھے کچھ پتہ ہی نہ چلتا کہ کہاں آ گئے ہیں نہ ہی کوئی زبان سمجھیں۔ بہر حال خدا خدا کر کے میں اور میرے ساتھی لندن جانے والی گاڑی تک پہنچ ہی گئے۔ صحیح سلامت اس کے اندر پہنچے تو بیٹھنے کے لئے جگہ بھی مل گئی۔ جب رودبار انگلستان کو عبور کیا تو پھر سر کے چکر آنے لگے مگر جلدی ہی مخلصی ہو گئی۔ ہم نے کیلے تا ڈوور عبور کیا اور ڈوور سے

سے سیدھی گاڑی لندن کو مل گئی ۔ لندن کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو مجھے
میرے لینے کے لئے تو ایک دوست تشریف لائے ہوئے تھے ۔ مگر دوسرے
دوست کے لئے کوئی نہ تھا ۔ وہ بڑا پریشان ہوا اور میں اس وجہ سے اسے نہ
کہتا تھا کہ میرا دوست کہے گا کہ اسے کیوں ساتھ لے جا رہے ہو ۔ بہرحال خیال یہ تھا کہ
دوست صاحب مجھے اپنا مہمان بنا کر لے جا رہے ہیں مگر یہ مہمان کا مہمان کیسے بن
سکتا ہے ۔ میرے الوداع ہونے پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ کیونکہ وہ نہایت
ہی پریشان ہو رہا تھا ۔

بعد میں علم ہوا کہ میں اس دوست کو خوشی سے لا سکتا تھا کیونکہ جہاں میرا
قیام ہو رہا تھا وہاں دس بارہ اور لوگ رہ رہے تھے ۔ اگر اس دوست کو میں ساتھ
لاتا تو گھر والے اور بھی خوش ہوتے مگر کاش کہ ایسا نہ ہوا اور آج تک اس معصوم
دوست کی بے کسی جب بھی آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو مجھے افسوس ہوتا ہے
ضمیر بے حد کوسنے لگتا ہے ۔ زندگی میں کئی واقعات ہر انسان کو پیش آتے ہیں
کہ معمولی لغزش سے ایسی غلطی سرزد ہوتی ہے جو زندگی میں کئی بار آپ کو ستاتی
ہے ۔ میرے ساتھ ایسے کئی واقعات رونما ہوئے جن واقعات کی یاد مجھے
بعض اوقات بے حد پریشان کر کے رکھ دیتی ہے ۔ غالباً یہ اس لئے ہوتا
ہے کہ میں طبعاً حساس واقع ہوا ہوں ۔ جس گھر میں میں اترا وہاں میرے
ساتھی (یعنی ہندوستان کے رہنے والے) اور بھی لوگ تھے جنہیں وہاں رہتے
ہوئے سالہا سال گزر گئے تھے اور وہاں کے حالات سے واقفیت تھی وہاں
رہنے سہنے کے آداب سے خوب واقف تھے ۔ مجھے اب رہنمائی کی چنداں ضرورت
تو نہ تھی ۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ کوئی ہمدردی یا دوستی کا اظہار نہ کیا ۔ مجھے
ابتدا میں یہ رویہ کچھ اچھا نہ لگا ۔ آخر اپنے ملک میں ہم ایک دوسرے سے

بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اور بے تکلف ہونے میں کوئی برسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر یہ ایسا معاملہ تھا کہ جیسے ہم ان کی سلطنت میں اپنی ایک مملکت بنانے آیا تھا۔ بہر حال چند دن گزرے تو مجھے علم ہوا کہ وہ سب ولایتی صاحب ہو گئے تھے۔ لہٰذا بلا تعارف مجھ سے گفتگو کرنا کیا گوارہ کرتے۔ ولایت میں عام طور پر لوگ فطرتاً خاموش اور چپکے واقع ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ولایت میں جا کر اس طرح ہو جاتے ہیں اس کی وجہ آج تک سمجھ نہ آئی۔ ہر ملک کے انسانوں کو اپنی اپنی فطرت عطا ہوئی ہے۔ اپنے اپنے اطوار ورثہ میں ملے ہیں جو لوگ ان فطرتی خصوصیات سے الگ ہو کر ایک نئی طرز زندگی کی طرح ڈالتے ہیں وہ محض ریاکاری اور بناوٹ کا شکار ہو کر اصل فطرتی خوبیوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو اللہ نے انہیں ماحول سے ودیعت کی تھیں۔

گھر والوں کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی وہ میری دل جوئی کرتی تھی۔ مجھے پریشان ہونے نہیں دیتی تھی۔ یہ ہمدردی وہ محض نیک نیتی سے کرتی تھی۔ آج میرے ذہن میں ساری بات صاف طور پر آئی ہے مگر اس وقت میں اس ہمدردی سے بھی پریشان ہوا تھا کہ خدا جانے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ صاحبزادی مجھ پر فوراً ہی عاشق ہو گئی ہیں! ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل دوستوں اور دشمنوں نے ایک ہی کہانی سنائی تھی۔ "لڑکیوں اور شراب سے بچے رہنا،" جب تک تجربہ نہ تھا ان دونوں سے میں بھاگتا تھا اٹلی سے آتے ہوئے بیئر کی بوتل کو پھینکا تھا۔ محض پریشان ہو کر اور یہاں آ کر ہمدردی کو بھی مطلب پرستی سے منسوب کیا۔

میں نے پہلے لنکزان میں داخلہ لیا۔ پھر یونیورسٹی کالج لندن میں اور انڈیا ہاؤس میں جا کر جائے رہائش کے لئے درخواست دی۔ جس کی دو دیوار

تھیں ۔ ایک تو اس لڑکی والے معاملہ سے گھبرا گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس گھر میں مہمان کی حیثیت سے جو ہفتہ وار خرچہ تھا وہ بہت زیادہ تھا اور میرے اقتصادی حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں اتنے بڑے خرچ والی جائے رہائش میں قیام کرسکوں ۔ مجھے فوراً ہندوستانیوں کی رہائش والے گھر کا پتہ دیا گیا ایک جگہ جہاں صرف میاں بیوی تھے اور کوئی ہندوستانی نہ تھا۔ میں چلا گیا۔ وہ جگہ مجھے پسند آئی ۔ واپس جب پہلے گھر میں رخصت لینے آیا تو وہ لوگ بے حد پریشان ہوئے ان کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ میں ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں ۔ یہ ایک اچھی بات تھی مجھے اپنے فیصلے پر بڑی پریشانی ہوئی ۔ مجھے اگر یہ علم ہوجاتا کہ یہ لوگ اس معاملہ کو پریشانی کا باعث خیال کریں گے تو میں ایسا کرتا ہی نہ فیصلہ کرنے کے بعد اب پھر اس کو بدلنا میں نے درست خیال نہ کیا۔ بادلِ نخواستہ میں لندن کے شمالی علاقہ میں چلا گیا وہاں پہنچ کر رہائش کرنے کے انتظامات مکمل کیے دوسرے دن میرا سامان بھی بحفاظت وہاں پہنچ گیا۔

مجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ میں یونیورسٹی میں داخلہ کے موزوں اوقات سے قبل چلا گیا تھا۔ یونیورسٹی میں جون جولائی میں چھٹیاں ہوگئیں اور بار کے لیکچر بھی ستمبر سے شروع ہونے تھے ۔ میں مارچ میں پہنچ گیا۔ یہ بڑا بے وقت موسم تھا۔ کم وبیش تین ماہ میں محض چکر کاٹنے لگا ۔ جو ایک نوجوان کے لیے بڑے خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ بڑی سوچ کے بعد میں نے اپنی قانون کتابیں جاکر خرید لیں اور ان کو پڑھنے لگا ۔ سارا دن تو قانون کی کتابیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کالج کے دوست بھی کہاں بن سکتے تھے۔ اس چکر میں پھنسا ہوا تھا کہ مجھ سے ایک اور غلطی ہوگئی ۔ میں ایک دن بڑا کوٹ پہنے بغیر باہر نکل گیا ۔ دور تک پیدل چلتا رہا۔ معمولی سی بارش ہوگئی اور دوسرے

دن مجھے بخار ہوگیا۔ یہ ملیریا کا بخار تھا۔ ملیریا مجھے ۱۹۲۷ء میں بھی ہوا تھا جبکہ وظیفہ کے چکر کاٹنے پڑے تھے۔ اس بیماری کے سوا مجھے باقی زندگی میں کسی بیماری کا سامنا نہ کرنا پڑا یہ خدا کا شکر ہے۔

ڈاکٹر کو دکھانے پر علم ہوا کہ ملیریا ہے۔ ایک ہندوستانی ڈاکٹر جہانگیر صاحب کے پاس اپنا علاج کراتا تھا مگر مجھے اس قدر کمزوری ہوگئی کہ بستر پر سے اٹھنے سے رہا۔ اس بیماری کے دوران میں مسز بیری (جو میری میزبان تھی) نے میری اتنی خدمت کی کہ شاید میری والدہ اتنی خدمت کرنے سے قاصر رہتی اور جو خدمت کا طریقہ میری اس میزبان کو آتا تھا۔ وہ ہمارے لوگوں کو سالہا سال کی ٹرینگ کے بعد ہی آسکتا تھا۔

میری میزبان

میری یہ میزبان مجھے ہر روز خود ایک قسم کا غسل کرواتی تھیں اور اور سارے بدن کو صاف کرتی تھیں۔ خود دوائی پلاتی تھیں۔ وقت بوقت خوراک کھلاتی تھیں وہ یہ سب کام ہنستی ہوئی کرتی تھیں۔ کبھی بھی ایک ماہ کی بیماری کے دوران میں میں نے اس کے ماتھے پر شکن تک نہ دیکھی تھی۔ وہ لوگ نچلی منزل میں رہتے تھے میں اوپر تھا اور اس نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ جب ضرورت پڑے صرف فرش کو ٹھوکر لگا دیا کرو۔ ٹھوکر لگاتے ہی وہ میرے پاس آجاتی اور اپنے فرائض کی انجام دہی جس خلوص سے وہ کرتی تھیں اس نے میرے دل و دماغ پر بے حد اثر کیا۔ جتنی ذہنی تربیت میری اس بیماری میں ہوئی۔ شاید ہی ویسے ہو سکتی تھی۔ اس تربیت کی میں نے کوئی قیمت ادا نہ کی تھی۔ جو خوبیاں میں نے اپنی

میزبان میں دیکھی تھیں۔ ان کا اثر میری ساری زندگی میں مجھ پر رہا۔ ایسی خدمت کا کیا صلہ ہو سکتا تھا۔ ایسی خدمت کا صلہ روپے پیسے نہیں ہو سکتا تھا اور ان کی مروت مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔

جنگ عالمگیر کے دوران

جب ۱۹۳۹ء میں چھٹیاں ہوئیں تو میں پیرس چلا گیا اور پیرس جانے سے پیشتر میں دوسری جگہ چلا گیا تھا۔ مسز بیری کو بے حد صدمہ ہوا مگر خاموش رہیں۔ جب اعلان جنگ ہوا تو میں اگست کے مہینے میں ڈووِل نامی جگہ میں مقیم تھا۔ وہاں سے ہم لوگ فوراً واپس آ گئے۔ واپسی پر مجھے اس جگہ نہ اطمینان، نہ آرام نصیب تھا۔ میں نے فوراً بیری کو ٹیلیفون کیا کہ کیا میں واپس آ سکتا تھا؟ اس نے خوشی سے میرا اپنے گھر میں واپسی پر خیر مقدم کیا۔ پھر واپس آنے تک (یعنی ۱۹۴۱ء تک) میں نے انہیں کے پاس قیام رکھا صرف جب لندن سے باہر کہیں جاتا تو وہ الگ بات تھی۔

کالج کھلا تو ہمارا کالج جنگ کی وجہ سے ویلز بھیج دیا گیا تھا۔ بعد میں کیمبرج آ گئے ورنہ میں ۱۹۴۱ء تک اسی گھر میں رہا۔ چنانچہ جب ۱۹۵۰ء میں نیویارک جاتے ہوئے میں لندن ٹھہرا تو میں نے پرانے گھر پر کئی بار ٹیلیفون کیا۔ ٹیلیفون آٹومیٹک تھا۔ کرتا رہا مگر جواب ندارد۔ ٹیلیفون ایکسچینج والوں نے یہ بات خود نوٹ کر لی۔ انھوں نے خود بخود مجھے پھر ٹیلیفون کر کے بتایا کہ اس ٹیلیفون والے لوگ اپنا مکان بدل گئے ہیں اور ان کا فلاں پتہ ہے۔ میں نے ایکسچینج والوں کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ پھر مسٹر بیری اور مسز بیری کو ملا تو وہ مجھ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے

اور کھانا کھلایا۔ اس عرصہ میں مسز بیری بمبئی تک ہو کر واپس آ گئی تھیں اور ہمارے ملک ہندوستان و پاکستان کے متعلق سب کچھ جان گئی تھیں۔

جب یونیورسٹی کالج کھلا ہمیں دلچسپی کے سامان مل گئے۔ کلاسیں لگنے لگیں دوسرے کئی دوست مل گئے۔ ان میں ہری سنگھ بھاٹی ریاست جودھ پور کے رہنے والے تھے۔ ذکی الدین خواجہ شہاب الدین کے فرزند یعنی خواجہ ناظم الدین صاحب کے بھتیجے تھے۔ ایک صاحب بنچ صاحب تھے جو آج کل ہندوستان کے کسی بیرونی ملک کے سفارت خانے میں ہیں۔ میری بے تکلفی زیادہ تر میرے دوست عبدالغنی صاحب سری نگر والے سے ہوئی جو آج کل ایبٹ آباد میں مقیم ہیں۔ ان کے پاس کافی پیسے تھے اور انھیں ولایت رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ ہم سب ایل ایل بی میں داخل تھے۔ ان جماعتوں کے لئے مختلف کالجوں میں جانا پڑتا تھا۔ پھر سردار یار محمد خان جو آج کل سیشن جج آزاد کشمیر میں ہیں، بھی وہاں مقیم تھے مگر دوسرے کالج میں تھے اور ان سے ملنا جلنا ضرور ہوتا تھا۔ میں نے ایل ایل بی اور بار دونوں کی تعلیم یکجا شروع کر دی جو مشکل بات خیال کی جاتی تھی مگر اپنی پڑھائی کے دوران میں لائبریری میں بیٹھ کر دن کو کم و بیش چار گھنٹے پڑھا کرتا تھا۔ اس کے بعد شام کے وقت کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا اگر وہاں طالب علم یہ معمول مستعدی کے ساتھ جاری رکھے تو کوئی وجہ نہیں کہ مشکل سے مشکل امتحان پاس نہ کرے۔ صرف یہ کہ زبان انگریزی میں آپ کو مہارت ہونی چاہیئے ورنہ کامیابی حاصل کرنے میں مشکل پیش آ جاتی ہے۔ پھر وہاں جا کر ہم کو لاطینی سیکھنا پڑی۔ کیونکہ رومن لاء کے لئے لاطینی کا سیکھنا ضروری تھا اس میں کافی محنت درکار ہوتی ہے۔ یہ کالج کا ابتدائی دور بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔

لندن یونیورسٹی کالج

جب کالج کھلا تو اس میں بڑی گہما گہمی تھی ۔ نئے نئے لوگ ۔ نئی نئی دوستیاں نئے نئے رومان اور خدا جانے کیا کیا آرزوئیں ! یونیورسٹی کالج لندن کی ایک رسم یہ ہے کہ کالج کھلتے ہی پہلے وقت میں ایک یونین ڈانس ہوا کرتا ہے ۔ تاکہ نئے طالب علم آپس میں متعارف ہو سکیں ۔ ان ملکوں کے لئے یہ بڑی اچھی اور دلچسپ رسم ہے ۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس بے تکلف سے ڈانس میں مختلف جگہوں کے اور مختلف ملکوں کے طالب علم اس میں باہمی راہ و رسم پیدا کر لیتے ہیں جبکہ ہر نئے طالب علم کو یہ خدشہ ہوتا ہے کہ دوست کے بغیر نہ رہ جائے گے

ہم جو ہندوستان سے گئے ہوئے نئے طالب علم تھے ۔ انہوں نے ڈانس کہاں سیکھا ہوا تھا مگر ہمیں بھی اس میں دھکیل دیا گیا ۔ مجھے وہاں گئے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے ۔ مگر یہ مشورہ کسی نے دیا ہی نہ تھا کہ اس فرصت کے وقت کم از کم ڈانس سیکھ لیتے کہ بعد میں اس قدر ندامت نہ اٹھانی پڑتی ۔ جب ڈانس کی ابتدا ہوئی تو ہم بہت سے لڑکے ہال کے ایک طرف بیٹھ گئے ۔ اسی طرح بہت سی لڑکیاں عین سامنے دوسری طرف بیٹھ گئیں ۔ نہ ہی ان کا کوئی ساتھی اور نہ ہی ان لڑکوں کا کوئی ساتھی تھا ۔ ہم میں سے کسی کو جرأت ہوتی کیسے جب کہ ڈانس کرنا سرے سے آتا ہی نہ تھا ۔ البتہ ایک موقعہ وہاں ایسا آتا ہے کہ لڑکے لڑکے ایک دائرہ بنا لیتے ہیں اور لڑکیاں اس دائرے کے اندر دوسرا دائرہ بنا لیتی ہیں اور ہر ایک کو اس میں شمولیت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے ۔ پھر یہ دائرہ چکر کاٹنے لگتا ہے چکر کاٹتے کاٹتے کھڑا ہو جاتا ہے ۔ جو لڑکی جس کے سامنے آ گئے ۔ اس کے

ساتھ لامحالہ آپ کو ڈانس کرنا پڑتا ہے۔ میری اس وقت کسی مرد دوست سے بھی واقفیت نہ تھی کیونکہ مرد دوست ہو تو پھر بھی بڑا سہارا ہوتا ہے ورنہ ڈانس ہال میں محض خود بیٹھے رہنا بہت ہی برا لگتا ہے خود انسان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ سارے ماحول میں غیر موزوں ہے۔

جب اس چکر میں ہم نے شمولیت کی تو بالآخر ایک لڑکی سے ڈانس کا موقعہ مل گیا۔ ان صاحبزادی کی عمر ۱۷، ۱۸ سال ہو گی۔ قد درمیانہ ہو گا۔ اس قدر حسین تھی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ سارا بدن مارے خفت اور حجاب کے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی ان سے معذرت چاہی کہ ڈانس سرے سے آتا ہی نہیں ہے۔ لڑکی نے بڑی ہمدردی اور بے حد فراخ دلی سے کہا "کیا ہوا جو نہیں آتا۔ میں تمہیں سکھا دوں گی"۔ اس گفتگو سے مجھے جو پسینہ آ رہا تھا وہ ذرا خشک ہوا۔ میں اس کے پاؤں کو بری طرح رگیدتا ہوا ہال کے ایک لمبے چکر میں گیا۔ کچھ گفتگو بھی جاری رکھی۔ اس شریف زادی نے میرے ساتھ بے حد ہمدردی کی اور سکھاتی گئی۔ دونوں چکر کاٹنے کے بعد ہم دونوں جا کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئے باتیں کرتے رہے وہ مختلف موضوعات پر مجھ سے گفتگو کرتی رہی۔ اس نے پہلے کسی ہندوستانی باشندے سے گفتگو نہ کی تھی وہ ایک دوسرے کالج سے آئی تھی جو یونیورسٹی آف لندن سے ہی منسلک تھا۔ ہمارے کالج سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ کچھ عرصہ گفتگو کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ پھر ملیں گے مگر پانچ چھ سو انسانوں کے طوفان میں دوبارہ ملاقات کا کیا موقعہ تھا۔ اس شام کے بعد پھر رات کے تین ۳ بجے تک ہم وہاں آوارہ گردی کرتے رہے ڈانس وغیرہ کی پھر جرأت ہی نہ ہوئی۔ لڑکی کو تلاش بھی کیا مگر وہ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اسے مجھ سے کچھ دلچسپی ضروری ہے مگر یہ خیال غلط تھا۔ بعد کے تجربہ نے بتایا کہ ایسی ملاقات کی دلچسپی دور تک نہیں لے جاتی

لڑکیاں ــــ اور مشرقی طلباء

برصغیر سے جانے والے طالب علم عجیب وغریب خیالات اور تصورات اپنے ساتھ ولایت لے جاتے ہیں۔ پھر وہاں جاکر ان لوگوں سے ملنے چلنے کے بعد نئی کوئی چیز بھی سیکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہم لوگوں کا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں جاکر یہ لڑکیاں ہم پر عاشق ہو جائیں گی اور ماری ماری ہمارے پیچھے پھریں گی مگر کوئی بھی شریف گھرانے کی لڑکی ایسا نہیں کرتی۔ ایسے خیالات ہمارے لوگوں کو عموماً اور خصوصاً طالب علموں کو اپنے ذہن سے نکال دینے چاہئیں ہمارے زمانے میں ایسے ہی خیالات ہوا کرتے تھے۔ ممکن ہے ایسی صورت حال اب نہ ہو۔ جب میں ولایت سے پڑھ کر واپس آیا تو میرے دوستوں نے ایسے ہی سوالات مجھ سے کئے اور میں نے ان کو واضح اور صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان سے جانے والے طالب علموں کے پاس کھلے پیسے ہوا کرتے تھے۔ سارے ہندوستان سے چند گنتی کے افراد وہاں جاکر تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ پھر یہ اپنے آپ کو راجے مہاراجے اور نواب ظاہر کر کے اپنے لئے ایک سوشل پوزیشن یا مقام حاصل کرتے تھے جو محض غلط اور بے حد گھٹیا حربہ تھا مگر وہ دن گزر گئے ہیں یہ طلسم اب دونوں طرف سے ٹوٹ چکا ہے۔

میں نے ولایت جاکر تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل بھی شروع کئے۔ وہاں میں نے ہاکی اور ٹینس کھیلنا شروع کیا۔ ہاکی کا میں سکول میں اچھا کھلاڑی تھا۔ ٹینس بھی اچھی سیکھ لی۔ ہاکی سے مجھے بے حد دلچسپی تھی۔ ہفتے میں دو بار کھیل سکتے تھے۔ ٹینس صرف ہفتے کے دن ہی آدمی کھیل سکتا تھا۔ وہ بھی اگر

اچھا ساتھی مل سکے تو ایک سال کے اندر اندر ہی کالج کی ٹیم میں آگیا۔ ٹینس میں صرف اپنی دل لگی کے لئے ہی کھیلتا رہا۔

دو زندگیاں

سوموار سے ہفتے تک ہم لوگ خوب کالج لائبریری میں محنت کرتے تھے اساتذہ کتابوں کے متعلق بتا دیتے تھے اور ہم لوگ اپنی اپنی جگہ لائبریری میں اطمینان سے جا کر پڑھتے تھے۔ اب مجھے اپنے اور ساتھی بھی مل گئے تھے جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ کالج کے دوران ایک شغل یہ بھی تھا کہ چائے کی پیالی یا کافی وغیرہ پینے کے لئے ایک بڑا ہال تھا۔ وہاں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے تفریح طبع کے بے شمار سامان ہوتے ہیں۔ وہاں دوست آپس میں ملتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں۔ سگریٹ پیتے ہیں۔ دوستیاں بھی اسی دوران میں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اس جگہ کا عجیب سا ماحول ہوا کرتا تھا جہاں لوگ زیادہ تر اپنے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسرے کے ماحول میں دخل کم ہی دیتے ہیں۔ یہ اس ملک کی بڑی اچھی اور یہاں کی روزانہ زندگی کا ہنوز معمول ہے۔ کاش ہم میں بھی اس قدر اصلاح ہو جائے۔ وہاں ایک آدمی دوسرے کے گھر میں جھانک کر دیکھنا اتنا ہی گناہ سمجھتا ہے جتنا کہ اس گھر کو لوٹ لیا جائے۔ برسوں لوگ ایک دوسرے کے پڑوسی کی حیثیت سے رہتے ہیں مگر ایک دوسرے کے گھر کے معاملات کے متعلق کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اس لئے انگریزوں کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ "ہر انگریز کا گھر اس کا پرائیویٹ محل ہے"۔ اس روایت پر عمل کرنے سے ہزار ہا مشکلوں سے آدمی آسانی سے چھٹکارا پا سکتا ہے ہمارے ملک میں اور سارے مشرق میں جو رواج ہے اس کا علم سب کو ہے

یہاں ہماری پرائیویٹ زندگی کوئی نہیں ہوتی۔ مغربی ممالک میں ہر شخص کی ایک پرائیویٹ زندگی ہے اور پبلک زندگی کا اس سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ یہ زریں اصول ہے ہمارے ملکوں میں خصوصاً جن لوگوں کو سیاسیات میں حصہ لینا ہو اس طرح سے ان کی پرائیویٹ زندگی ختم ہو جاتی ہے وہ پبلک میں ہوں یا پرائیویٹ زندگی میں انہیں یکساں معیار رکھنا پڑتا ہے۔ ہر ایک سیاست داں کی پرائیویٹ زندگی فوراً اخباروں کے ذریعے پبلک کے سامنے لائی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے چھوٹے چھوٹے الزامات ایک انسان پر لگائے جاتے ہیں کہ ایک صاحب ضمیر انسان محض پریشان ہی نہیں ہوتا بلکہ انسانی قدروں پر اس کا یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔

شراب اور صحافت

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے میرا مطلب واضح ہو جائے گا۔ مجھ میں بڑی بڑی عادتیں ہونگی، کس میں نہیں ہوتیں۔ مگر عادتاً شراب نہیں پیتا اس لئے نہیں کہ میں بہت پرہیزگار ہوں۔ بلکہ مجھے شراب پینے کا کوئی مذاق ہی نہیں۔ چنانچہ ایک بار جب میں سکندر مرزا صاحب سابق صدر پاکستان کی ملاقات کے لئے گیا تو انھوں نے مجھے شراب پیش کی۔ وہ ابھی ڈیفنس سیکرٹری تھے۔ وہ خود بھی پی رہے تھے انہیں پینے کا شوق تھا اور وسکی پی رہے تھے میں نے انکار کیا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے "تم نے بیرسٹری کہاں سے کی تھی۔ شاید ولایت میں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی کوئی جزیرہ ہو گا جہاں سے بیرسٹر کر آئے۔ مجھ سے وہ خفا ہو گئے اور پھر کہنے لگے "تمہاری ہماری دوستی کیسے ہو سکتی ہے" میں نے انہیں سمجھایا کہ میں ایسا اس لئے نہیں کرتا کہ مجھے اس سے

کوئی سخت قسم کی نفرت ہے بلکہ میں نے عادت نہیں ڈالی، نہ ہی شراب خوری کا مذاق مجھ میں موجود ہے۔ واقعہ دراصل یہ نہیں تھا جس کا ذکر میں کرنے والا تھا بلکہ قصہ یہ تھا کہ ایک رسالے نے میرے متعلق ایک صاحب کا مضمون لکھا کہ :-

میں جب دوپہر کو سردار ابراہیم سے ملنے گیا تو ان کی آنکھیں شراب سے مخمور تھیں" اس سے بدتر الزام کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے مخالفوں کے ہتھکنڈے تھے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آنکھیں مخمور کرنے والی شراب دن کے دو بجے پینے کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر میں شراب پیتا ہوں جو مجھے دن رات مخمور رکھے تو غالباً یہ معاملہ سب کو آج تک معلوم ہو جانا چاہیئے تھا۔ کہ پاکستان میں مجھے اب تک ہر طبقہ کے لوگوں سے پالا پڑا ہے۔

اسی قسم کی اور کئی چیزیں میرے متعلق اخبارات میں آئیں۔ جو ولایت جیسے ملک میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی سب بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا قانون شخصی حیثیت کی ضمانت ایسی دیتا ہے کہ اور کسی ملک کا قانون نہیں دیتا۔ کسی کے خلاف (بلا تمیز۔ کہ وہ چھوٹا ہے کہ بڑا ہے) ہتک آمیز۔ تحریر لکھنے یا چھاپنے پر وہاں کی عدالت لکھنے والے کا دیوالیہ نکال دے گی اس وجہ سے کوئی اخبار کیچڑ اچھالنے سے پہلے تمام معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیتا ہے اور ساری بات کی مکمل چھان بین کر لیتا ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ملک میں بڑی سے بڑی شخصیت کے خلاف بھی کیچڑ اچھالا جا سکتا ہے اور ہمارا قانون اگر کسی شعبہ میں کمزور ترین ہے تو یہی کہ شخصی عزت کی کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔ بلکہ عزت ہتک کے جو دعاوی ہوتے ہیں ان میں دعویٰ کرنے والے کو سب سے زیادہ بدنام کیا جاتا ہے اگر دعویٰ کرنے والا پہلے کم بدنام ہو کو عدالت میں آکر اس سے کئی گناہ بدنامی

حاصل کرے گا۔ اگر کچھ ثابت ہوگیا تو عدالت ملزم کو ایسے کیس میں تھوڑا جرمانہ کرکے چھوڑ دیتی ہے یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس کی اصلاح ہوجائے تو ہم بھی ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہوسکتے ہیں۔ مگر ایسی اصلاح کا پہلو کوئی ابھی تک سامنے آتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہر سیاستدان کے لئے ہمارے ملک میں یہ پہلو مایوس کن ہے۔ ویسے بھی سیاست یہاں ایک بدنام کھیل ہے۔ اور اس وجہ سے یہ کھیل زیادہ گندہ اور بدنام ہوجاتا ہے۔

کالج کے مباحثے

ہمارے کالج میں ہفتہ میں ایک بار علمی سیاسی مباحثے ہوا کرتے تھے اسکی ذمہ دار کالج کی یونین تھی جس کا معیار بلند تھا۔ اس میں بعض بڑی بڑی پایہ کی سیاسی تقاریر ہوتی تھیں اور ہندوستان کی آزادی کے موضوع پر بے باکی و جرأت سے ہندوستانی طالب علم تقریریں کرتے تھے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے انگریز وہاں کے خصوصاً لیبر پارٹی والے لوگ ہم سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان مباحثوں میں ہمارا ساتھ دیتے تھے۔ ان مباحثوں میں ہمارے ہندوستانی طالب علم انگریزوں سے سخت کلامی بھی کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسے سخت الفاظ استعمال ہوتے تھے کہ مہذب سوسائٹی میں ایسے نہیں ہوتا۔ انگریز لڑکے جو ہمارے بالمقابل بیٹھے تھے۔ وہ جواب بھی دیتے تھے۔ ان میں میں نے ہمیشہ رواداری کا مادہ اتم درجہ پایا۔ ہم لوگ جذبات کی رو میں بہ جاتے تھے۔ اپنے دل کی گہرائی کے خیالات کو اگل دیتے تھے وہ تحمل اور اطمینان سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح کیمبرج یونیورسٹی میں جب جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۰ء میں ہمارے کالج کا انتقال مکانی ہوگیا تو وہاں بھی یونین میں ایسی تقاریر ہوتی تھیں۔ حالانکہ اس وقت

زندگی اور موت کی کشمکش میں انگریز لوگ مبتلا تھے۔ پھر بھی وہ تدبر، فراست اور بردباری کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ یہ خوبی ان لوگوں میں حیث القوم میں نے پائی مگر یہ خوبی اور مادہ ہم میں نہیں ہے بلکہ ہم محض ذاتی جذبات کا شکار ہو کر ابل پڑتے ہیں۔ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسرے کو ٹھنڈے دل سے اپنے نقطۂ نظر پر لانے کی بجائے اس سے ہاتھا پائی پر اتر آتے ہیں۔ پھر ہر معمولی سی بحث میں اونچی آواز میں بڑے بڑے الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ خود تو دوسرے کے جذبات کا احترام نہیں کرتے، دوسرا برابر کا جواب دے تو غصہ آتا ہے۔ ہماری قومی طرز زندگی میں یہی فرق ہے۔ اس میں اٹلی کے لوگ اور فرانس کے لوگ بھی ہم سے ملتے جلتے ہیں۔ امریکہ میں بھی اس بردباری کا مظاہرہ نہیں ہوتا جو انگلینڈ میں لوگ کرتے ہیں۔ ساری تہذیب کا نچوڑ اگر کوئی چیز ہے تو دشمن کے نکتہ نظر کے لئے اپنے دل میں گنجائش پیدا کرنا ہے۔ اگر دوسرے کے جذبات خیالات اور احساسات کا ہمارے دل میں احترام نہیں ہے تو اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ ہمارے جذبات کا احترام کرے گا بڑی نادانی ہے۔ ٹھنڈے دل سے مخالف کے مباحثے کو دلچسپی سے سننا اور پھر اس کو اظہار خیال کا مکمل موقع دینا ہی انسانی تہذیب کے زریں اصول ہیں۔ کاش کہ کالجوں اور سکولوں میں اس پہلو پر کماحقہ زور دیا جائے اور ہمارے نوجوان جب کالجوں کی تعلیم سے فارغ ہوں تو ان کے دل متوازن ہو کر نکلیں۔ تاکہ زندگی میں دوسرے کے خیال اور نکتہ نظر کو سننے کا حوصلہ ہو۔ پھر ٹھنڈے دل سے سوچا ہوا معقول جواب دیا جائے اور ذاتی حملے سے پرہیز کیا جائے۔

میں نے ولایت چار سال کے عرصہ میں رہ کر کوئی تقریر نہ کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تقریر کرنا ایک بڑی مشکل بات ہے۔ تقریر کے تصور سے پسینہ آجاتا تھا۔

تقریر کرنے کا شوق بے حد تھا مگر تقریر ——— اور میرے درمیان کوئی ایسا پردہ ضرور تھا جس کو پھاڑنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں کوئی اتنا شرمیلا بھی نہ تھا کہ منہ چھپاتا پھرتا۔ میرا کوئی ایسا جسمانی نقص نہ تھا جو مجھے پبلک کے سامنے کھڑے ہونے سے پریشان کرتا۔ میری زبان (انگریزی) میں اچھی خاصی چلتی تھی۔ بسا اوقات انگریز لڑکیوں نے میری انگریزی زبان پر حاوی ہونے کی بڑی بے تکلف تعریف بھی کی تھی۔ بلکہ ولایت میں عموماً میرے گورے رنگ کی وجہ سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ میری ماں یا باپ انگریز ہوئے ہوں گے کیونکہ ہندوستانی ہونے کا تصور۔ بنگال یا مدارس والوں کا ہوتا ہے کہ ہندوستانی رنگ کے کالے ہوتے ہیں۔ یہ تصور محض اس لئے ان کے خیال میں پھیلا کہ پہلے پہل بنگال والے ہی ولایت گئے۔ انھوں نے ان لوگوں کے ذہنوں پر اپنا یہی تصور چھوڑا ہے۔ جب وہ لوگ انگریزی بولتے ہوئے مجھے سنتے تو ان کو اور بھی یقین ہو جاتا مگر یہ بات مجھے پسند نہ تھی۔ اس لئے میں فوراً ہی موقعہ حاصل ہونے پر اس کی سختی سے تردید کر دیتا پھر ان کو یہ سمجھانا پڑتا کہ شمالی ہندوستان کے لوگ یعنی صوبہ سرحد پنجاب سندھ اور کشمیر کے قبیلے بڑے گورے رنگ والے ہوتے ہیں۔

. . . اور آگ برسنے لگی

میں تقریر کے متعلق یہ کہہ رہا تھا کہ سب کچھ ہونے کے باوجود تقریر کرنا نہ سیکھ سکا۔ کس طرح مجھ میں تقریر نہ کرنے والا حجاب نہ ختم ہوا وہ بحیثیت خود ایک کہانی ہے جو مناسب وقت پر عرض کروں گا۔

جب ۱۹۲۹ء اگست وغیرہ میں چھٹیاں ہوئیں تو میں ایک دوست کے ساتھ

فرانس چلا گیا۔ پیرس وغیرہ سے ڈویل ترڈیل چلے گئے۔ یہاں ڈویل ترڈیل آغا خاں کا ایک ولا بھی ہے۔ یہ بڑی دل چسپی والی جگہ ہے۔ میرے دوست کے پچھلے سالوں والے دوست بھی یہاں آئے ہوئے تھے ایک لڑکی کے ساتھ اس کا تعارف تھا۔ دوسری اسکی چھوٹی بہن کے ساتھ اس نے میرا تعارف کروایا۔ ہم اکٹھے ٹینس کھیلتے تھے۔ سمندر کنارے جاکر نہاتے تھے۔ بہر حال ہر قسم کے مشاغل میں مصروف رہتے تھے ابھی تک یہاں ہم اپنی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور جرمن ہوائی جہازوں نے وارسا پر بمباری کی۔ ساری دنیا کے لئے یہ پریشان کن فضا تھی۔ انگلینڈ نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ سب برٹش پاسپورٹ والوں کو ریڈیو پر کہا گیا کہ وہ فوراً ولایت واپس چلے آئیں۔ ہم نے فوری طور پر بستر باندھا —— اپنے دوست کو بادلِ نخواستہ الوداع کہی اور دوسرے دن لندن پہنچ گئے۔

لندن پر بمباری کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ لندن حتی الامکان خالی کر دیا جائے۔ تمام سکول اور کالج لندن سے باہر بھیجنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس فیصلے کے تحت ہم لوگوں کو ویلز سمندر کے کنارے ایک شہر ایبرڈ سوتھ بھیج دیا گیا۔ جہاں ایک یونیورسٹی کالج پہلے سے موجود تھا۔ لندن کے تمام طلباء وہاں پہنچ گئے۔ ویلز کا ایک معمولی شہر کہاں اور لندن کہاں۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم کو ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا ہے۔ خود ایبرڈسوتھ کا قصبہ اس طوفان سے پریشان ہو گیا جو لندن سے وہاں چڑھ آیا تھا۔ مگر جنگ میں سب کچھ ہوتا ہے۔ میں اور ہری سنگھ بھائی اور میرے دوست، جو سری نگر کے رہنے والے تھے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے، ایک مکان پر ٹھہر گئے۔

ڈاکٹر الہ دتہ ایک دوسرے مکان میں ٹھہرا۔

اے بنی اسرائیل

ہمارے ساتھ کچھ یہودی طالب علم بھی ہوا کرتے تھے۔ اس دور میں جب جنگ کا آغاز ہوا تو یہودیوں پر ظلم ہونے لگا۔ تمام انگلستان یہودی مہاجروں سے بھر گیا۔ ہماری جماعت میں مختلف یورپی ممالک کے یہودی لوگ تعلیم پا رہے تھے۔ ان لوگوں سے مجھے اس دور میں پوری طرح گھل مل کر رہنے کا موقعہ ملا۔ ان کی ذہنیت کا جائزہ لینے کا بڑا وقت ملا۔ یہ لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ دنیا کی ذہین ترین قوم یہی یہودی ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکر اور سائنسدان ان ہی لوگوں نے پیدا کئے۔ میں نے اس میں بڑی تحقیق کی کہ آخر دنیا کی یہ ذہین ترین قوم دربدر کیوں ہے اور صدیوں سے بے خانماں کیوں ہو رہی ہے۔ ان لوگوں میں جو چیز اتم درجہ ملتی ہے وہ یہ ہے کہ بھیڑوں کی طرح یہ ایک علیحدہ قوم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرتے ہیں۔ جس قدر ذہین اسی قدر یہ قوم خود غرض ہے یہودی کے کسی کارخانے کسی مکان یا کسی معمولی سے کام میں بھی سوائے یہودی کے اور کسی کو ملازمت نہیں مل سکتی۔ کسی دوسری قوم سے شادی نہیں کرتے۔ اس معاملے میں سخت ترین متعصب واقع ہوئے ہیں یہ لوگ روپے کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ روپے کمانے کے ہر طریقہ کو جائز خیال کرتے ہیں۔ ایک معمولی پیسے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیں گے خود اچھا لباس پہنیں گے اچھا کھائیں گے مگر دوسروں کے لئے کنجوس ترین قوم یہی ہے۔

اگر کوئی دوسری قوم دنیا میں ان یہودیوں کا ذہانت اور باقی خصائل وغیرہ

میں کچھ مقابلہ کرتی ہے تو وہ کشمیری پنڈت ہے۔ کشمیری پنڈت کو بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے بہت سے معاملات میں ملتی جلتی ہیں۔ کشمیری پنڈت اگر ایک دفتر میں ملازم ہو جائے تو سارے خاندان کو وہاں ملازم رکھوا لے گا۔ پھر اس دفتر میں دوسرے کسی کے لئے کسی مقام کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کشمیری پنڈت ایک سگریٹ بھی رشوت لے لیتا ہے مگر مفت کسی دوسرے کا کام نہیں کرتا۔

کہتے ہیں کہ کشمیر کی جنگلات کی سروس میں ایک صاحب کشمیری پنڈت تھے انہوں نے ایک سائل سے رشوت مانگی کہ پچیس روپے رشوت لانا مگر دوسری تاریخ جب سائل گیا تو وہ رشوت کا روپیہ مہیا نہ کر سکا مگر سائل کو معلوم نہ تھا کہ کشمیری پنڈت صاحب تبدیل ہو چکے ہیں۔ سائل نے بڑی منت کی کہ اگلی بار پر معاملہ رکھا جائے مگر وہ افسر صاحب نہ مانے۔ سائل نے چاروناچار کہا کہ "اچھا پھر فیصلہ کر لو کیونکہ میرے پاس کچھ نہیں۔" افسر نے اس سے پوچھا کہ واقعی کچھ بھی نہیں ہے؟ سائل نے کہا کہ "ایک دو آنے واپسی کرائے کے لئے ہیں اس نے کہا کہ "اچھا یہی دے دو!" اور اس کا کام جانے سے قبل کر دیا۔ کام ضرور ہی کر دیتے ہیں اگرچہ سگریٹ لے کر بھی کر دیں گے مگر مفت نہیں کریں گے۔

مجھے سری نگر کا ایک ایسا ہی واقعہ یاد ہے کہ تانگے پر ہم لوگ جا رہے تھے۔ راستہ میں دو تین سپاہی پولیس کے آ گئے۔ تانگے والے نے غلط راستہ پکڑا ہوا تھا۔ سواریاں بھی زیادہ لادی ہوئی تھیں۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس نے جیب سے تین چار سگریٹ دور سڑک پر پھینک دیئے۔ وہ سپاہی بھاگتے ہوئے سگریٹوں کی جانب چلے گئے اور تانگے والا مزے سے چلا گیا۔ میں

نے پریشان ہو کر اس سے دریافت کیا یہ کیا معاملہ ہے تو اس نے کہا صاحب
یہ ان کی رشوت ہے وہ نہیں جانتے ہیں اور ہم انہیں جانتے ہیں۔۔۔۔
۔۔۔۔ ولی را ولی می شناسد۔

اہل ویلز

ویلز ایک دلچسپ ملک ہے۔ اہل ویلز انگریزوں کو پسند نہیں کرتے ہیں ان میں سے کئی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انگریزوں نے انہیں غلام بنا رکھا ہے جیسے آئرلینڈ والے خیال کرتے تھے۔ مگر سکاٹ لینڈ والے لوگ ایسا محسوس نہیں کرتے بلکہ انگریز یہ شکایت کرتے ہیں کہ ساری سول سروس پر سکاٹ والے لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سکاٹ والے لوگ بڑے محنتی اور باضمیر قسم کے کارکن ہوتے ہیں۔ ویلز کے لوگوں کو ہم ہندوستان والوں سے اس وقت ہمدردی ہوا کرتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان آزاد ہونا چاہیئے۔ ہر بحث میں ویلز والے لوگ ہمارا ساتھ دیا کرتے تھے۔ آئرلینڈ والے تو زیادہ ہی ہمارے نزدیکی بنتے تھے۔ آئرلینڈ کے لوگ بھی کچھ ہم سے فطرتاً ملتے جلتے ہیں۔ ہماری طرح جذباتی ہوتے ہیں۔ دل میں گہرائی نہیں رکھتے منہ پر لڑائی مول لے لیتے ہیں۔ سکاٹ لینڈ کی لڑکیاں انگریز لڑکیوں سے زیادہ بلند ہوتی ہیں۔ ویلز کی لڑکیاں زیادہ رجعت پسند ہوتی ہیں اور پسماندہ ہونے کی وجہ سے تنگ دل بھی ہوتی ہیں۔

اس زمانے میں ہندوستانی لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں دوستی بھی لگا سکتی تھیں اور کھلے بندوں پھر بھی سکتی تھیں ایک زمانہ گزرا ہو گا جب کہ ایسا کرنا برا مناتے ہوں گے۔ مگر حبشی کے ساتھ ابھی تک اگر کسی عورت کو انگریز کے

سامنے بازار میں جاتے ہوئے دیکھ لیں تو سخت بُرا مناتے تھے۔ گو انگریز لوگ اپنی لڑکیوں کو ہمارے ساتھ پھرتا ہوا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس اگر ہمارے ملک میں کوئی لڑکی اس دور میں انگریز کے ساتھ کھلے بندوں لاہور جیسے شہر میں بھی چلتی دکھائی دے تو فساد ہونے کا خطرہ اغلب ہے۔ اس کے باوجود انگریزوں کے ذمے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ رنگ کی تمیز کرتے ہیں۔ آپ خیال کریں کہ ہم آج بھی (اور مسلمان ہونے کے باوجود) اپنی کسی لڑکی کو حبشی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیں تو خون کھولنے لگتا ہے۔ اس لیے جو معاملہ ہمیں خود پسند نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ ایسا معاملہ ضرور روا رکھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا میں ابھی تک تعصب تنگ نظری اور تنگ دلی ہے۔ امریکہ میں، افریقہ میں اور روس میں بھی کالے گورے کی تفریق موجود ہے۔ دنیا ابھی تک اتنی مہذب نہیں ہوئی ہے کہ اس تفریق کا قلع قمع کر سکے۔ ہندوؤں کی سوسائٹی تو کسی دوسری قوم کا گلہ کر ہی نہیں سکتی۔ ہندوؤں میں جو چھوت چھات کی رسم ہے یہ اس قدر وحشی ہونے کی مثال ہے کہ اس کے ساتھ کی دنیا میں کوئی بدتمیزی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہندوں نے اپنے سوشل نظام میں آدھی قوم کو غلام در غلام رکھا ہوا ہے ایسے سوشل نظام سے بدتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم ہندو یا مسلمان طالب علم ولایت والوں سے سخت گلہ کیا کرتے تھے کہ ان کے یہاں کالے گورے کی تمیز ہے مگر انسان کے علم میں اضافہ ہونے سے اس کے خیالات میں توازن پیدا ہوتا ہے۔

عادات پر قابو

ویلز کے اس قصبہ میں میری جوانی کے بہترین ایام گزرے۔ مجھے ایسے دوست یہاں مل گئے جن کے ساتھ اتنے اچھے تعلقات پیدا ہوئے کہ سال بھر میری زندگی بڑی پُر لطف رہی۔ یہاں میں نے ان دوستوں کی وساطت سے ڈانس کرنا سیکھا اور سوسائٹی کے سب تکلفات سے متعارف ہوا جن سے اس سے قبل نہ تھا۔ میں نے سگریٹ پینے یہاں ہی سیکھے۔ مگر سگریٹ پینے کی عادت نہ ڈالی۔ سوسائٹی سے لطف اندوز ہونے کے لئے پی لیتا تھا۔ مگر ہندوستان (کلکتہ) میں قدم رکھتے ہی پھر سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔ مجھ میں یہ بات ضرور ہے اور لوگوں میں بھی ہو گی کہ کسی عادت کا غلام نہیں ہوں۔ عیش ملے تو اس سے ایک حد کے اندر رہ کر محظوظ ہو جاتا ہوں۔ اگر نہ ملے تو اس کے پیچھے بھاگتا نہیں ہوں۔ میں نے یہ کبھی پرواہ نہ کی کہ اچھا ہی بستر ہو تو سو سکتا ہوں بلکہ نیند آئی ہو تو سڑک کے کنارے بھی سو سکتا ہوں۔ اگر گہری تھکاوٹ ہو تو جوتے پہنے ہوئے بھی گہری نیند سو سکتا ہوں۔ میں ہر قسم کا کھانا ہضم کر سکتا ہوں۔ مکی۔ باجرے کی روٹی لسی کے ساتھ کھا کر خوشی سے ہضم کر لیتا ہوں۔

اور اگر مکھن ہو تو اسے بیں اور خوشی سے کھاتا ہوں۔ زیادہ مرغن خوراک کا میں کبھی دلدادہ نہیں تھا۔ جتنی سادہ غذا مجھے مل جائے اس کے کھانے میں کبھی تکلف نہیں ہوا۔ مجھے چائے یا کافی پینے کی کوئی عادت نہیں ہے اگر چار بجے چائے مل جائے تو خوشی سے پی لیتا ہوں اگر نہ ملے تو اس کے انتظار میں بے بس ہو کر بیٹھ نہیں ہو سکتا۔ میری طبیعت ہی بے طلب صبر کی

اور بے قراری ہے۔ لکھنے میں میرے خیالات جس رفتار سے پیدا ہوتے ہیں اس رفتار سے میں لکھ نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لکھتے ہوئے میرے خیالات آگے نکل جاتے ہیں اور تحریر میں کئی حروف رہ جاتے ہیں۔ اگر میں اپنا لکھا ہوا خط دہراؤں نہ تو اس میں اتنے حروف حذف ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آسکتا۔ میرے لیے شارٹ ہینڈ والے کو لکھانا بہت ہی آسان ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں بیس مختلف معاملات پر باقاعدہ لکھا سکتا ہوں۔

مجھے ریاکاری سے نفرت ہے

مجھ سے یہ ریاکاری نہیں ہو سکتی۔ میں جھوٹ بول سکتا ہوں مگر کسی کی تعریف اس کے منہ پر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے کہ وزیراعظم لیاقت علی خاں مظفرآباد تشریف لے گئے۔ مجھ سے ان کا تعارف اہلکاروں سے نہ کرایا جاسکا۔ کیونکہ اس میں انکی تعریف کے الفاظ کہے جانے تھے۔ اس وجہ سے وہ بھی پریشان ہوئے اور مجھے تو پریشان ہونا ہی تھا۔ مجھ سے اپنی خوشامد بھی نہیں سُنی جاتی۔ مجھے پسینہ آنے لگتا ہے۔ اسلئے جب کوئی صاحب میری تعریف کریں تو میں خود بول کر اس کو ٹال دیتا ہوں۔ مجھے اپنے دشمن سے اتنی نفرت نہیں جتنی ریاکار سے ہے۔ سیاسی مخالف جو سامنے اگر مخالفت کرے اس کے ساتھ عداوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ساتھ جنگ ہے اعلان جنگ کے بعد۔ مگر جو دوست بن کر دھوکا دے وہ بدترین انسان ہے جو ریاکاری کرے اور دوست بن کر دھوکا دینا اپنا شعار بنالے اس کی خود اپنی کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ وہ خود بدترین کردار

ادا کر رہا ہوتا ہے۔ مرد میداں وہی ہے جو میدان میں آ کر دوسرے کی مخالفت کرے ہر مقابلہ کے لئے تیار رہے۔ میدان میں سامنے آ کر لڑنے والا دشمن بہادر انسان ہے۔ اس کی قدر ہر اچھا آدمی کرے گا مگر پیچھے سے حملہ کرنے والا ریاکار کبھی سرخرو نہیں ہو سکتا۔

انگریز کے کیریکٹر میں اگر کوئی تھوڑی سی بات قابلِ اعتراض ہے تو یہی ان کی ریاکاری ہے جسے وہ ڈپلومیسی کہتے ہیں۔ یہ ان کی سرشت میں ہے۔ اس ڈپلومیسی کے بل بوتے پر انگریز یورپ میں صدیوں سے ایک خاص کردار ادا کر رہا ہے۔ شاید ایک جزیرہ کے رہنے والے ہونے کی حیثیت سے اور ایک چھوٹا ملک ہونے کی وجہ سے ان کو زیادہ کام ڈپلومیسی سے لینا پڑتا ہے یا یہ عادت ہے۔ بہر حال یورپین۔ فرانس والے، جرمنی والے یا اٹلی والے، انگریز سے زیادہ جذباتی لوگ ہیں۔ اس لیے اپنے جذبات کے اظہار میں اتنی گہرائی نہیں رکھتے۔ ان کے خیالات میں وہ پختگی نہیں ہوتی جو اہل انگلینڈ میں پائی جاتی ہے انگریز اظہار خیال سے پہلے ضرور معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے گا۔ پھر اپنے خصوصی انداز میں اس معاملہ پر رائے زنی کرے گا۔

میں دوران جنگ ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک ولایت میں رہا۔ اور اس عرصہ میں وہاں اہل انگلستان کے لیے نازک ترین دور بھی آئے۔ جب کہ ڈن کرک سے ان کو بھاگنا پڑا۔ پھر ۱۹۴۰ء میں لندن پر بم باری ہوئی۔ ان دونوں حادثوں کے دوران اہل انگلستان کو وہاں رہ کر میں نے نزدیک سے دیکھا۔ جس ٹھنڈے دل سے اور گہرائی قلب سے ان لوگوں نے ان حادثات کا مقابلہ کیا وہ بے مثال ہے زیر زمین سٹیشنوں پر ان کے بیوی بچوں کو پڑے ہوئے دیکھا، ایسے ماحول سے بو آتی تھی وہاں کھڑا مشکل تھا۔ میری

آنکھوں کے سامنے حصے کے حصے شہر کے اڑ گئے۔ جس میں سینکڑوں انسانوں کی جانیں لمحوں میں قربان ہو گئیں مگر شکایت کسی کے منہ پر نہیں سنی۔ اگر یہ زندہ قوم نہ ہوتی تو ڈن کرک کے بعد ان کو ہٹلر کے سامنے بلا شرط ہتھیار ڈال دینے چاہئیں تھے۔ ویلز میں جب یہ لوگ سڑکوں میں رکاوٹیں بنا رہے تھے ہم اپنی جگہ ان پر ہنستے تھے۔ کیونکہ اس وقت یہ خیال تھا کہ ہٹلر کی فوجیں انگریزان کا ملیامیٹ کر دیں گی مگر یہ لوگ اپنے کام میں لگے رہے کسی سٹیج پر ان لوگوں نے ہمت نہ ہاری۔

گناہ ـــــ اور سوسائٹی

ویلز کے اس چھوٹے سے شہر میں (جو ایک سمندر کے کنارے تھا) ہمارے مشاغل دلچسپ تھے۔ پڑھائی کی جانب مناسب توجہ ضرور دیتے تھے جنگ لگ جانے کی وجہ سے سب انسانوں میں ایک توکل کا رجحان پیدا ہو گیا کہ خدا جانے کس وقت وہ ایک بم کا شکار ہو جائیں تو دنیا کی سب نعمتیں یہاں ہی رہ جائیں گی۔ اس لئے جو بھی حظ ہم اٹھا سکتے تھے اس کے اٹھانے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ میں نے اس شہر میں آکر پہلی بار اچھی طرح ڈانس کرنا سیکھا ایک لڑکی جو ہمارے اپنے ہی کالج کی تھی۔ اس نے مجھ میں بڑی دلچسپی لینی شروع کی اور اس توجہ کی وجہ سے میں نے اپنے آپ میں تمام وہ خصائل پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی جن خصائل کے بل بوتے پر اس ملک میں ایک شریف آدمی شریف لوگوں کی سوسائٹی میں عزت سے دن گزار سکے ظاہر ہے کہ ایسی اس قسم کی عادتیں خواہ مخواہ میں نے اپنے اوپر سوار نہ کیں جن سے ایک شریف زادہ بدنامی کے دروازے پر جا کھڑا ہو۔

انگریز لڑکیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے بغیر ایک نوجوان ولایت جاکر نہیں رہ سکتا۔ اس میں پرہیزگاری یا گناہ کا پہلو اس لئے نہیں کہ اس ملک میں رہ کر آپ ایک سادھو کی زندگی بسر نہیں کرسکتے مگر اچھی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہر لمحہ گناہ ہی کرنے پر آدمی تل جائے۔ آپ ان ملکوں میں گھٹیا جذبات کا مظاہرہ کئے بغیر بھی اچھی سوسائٹی اور اچھے لوگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم تین چار دوست اکٹھے ہو کر بسا اوقات پہاڑیوں پر جاتے تھے۔ دن بھی سیر کیا کرتے تھے۔ پھر سمندر کے کنارے جاکر دن بھر نہاتے رہنا، اگر دھوپ چڑھی ہو تو یہ ایسے مشاغل ہیں جو شریفانہ ماحول میں رہ کر آپ ان میں خوشی سے حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر ہفتہ کے اختتام پر ایک اچھا ڈانس ہوا کرتا تھا۔ ہم سب طلباء اس میں جاتے تھے۔ اس میں ہمارے اساتذہ بھی جایا کرتے تھے۔ پھر ہفتے میں ایک بار ایک اچھا موضوع بحث رکھ کر یونین میں تقاریر ہوتی تھیں۔ یہ تقاریر بے حد دلچسپ تھیں جو ہم جاکر سنا کرتے تھے۔ ہندوستان کے کرشنا مینن کو ہم ہندوستانی طلباء نے ایک بار وہاں ہی بلایا تھا۔ مگر ان کی شکل اس قدر بھونڈی اور خوفناک ہے کہ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ ویسے بھی ان کی تقاریر سخت الفاظ سے مزین ہوتی تھیں۔ ان کی زبان کرخت ہے۔ اس میں سختی کے الفاظ کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ عالم بھی نہیں ہیں۔ اسی لئے کرشنا مینن کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتے۔ اس کے برعکس ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو انڈین یونین میں لندن میں تشریف لائے۔ ہم سب انھیں سننے گئے۔ مقرر کی حیثیت سے وہ مایوس کن تقریر کرتے تھے مگر ان کی زبان میں ایک مٹھاس ہوتی تھی جو کرشنا مینن میں ایک ذرہ بھر بھی نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں میری ہری سنگھ گور (جو بڑے ہندوستانیوں میں شمار ہوتے تھے) سے ملاقات بھی ہوئی۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔

اس قصبہ میں کسی قسم کے حملے کا کوئی خطرہ نہیں تھا نہ ہی ہوائی حملے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ دوسرے کسی حملے کا سوال ہی نہیں ہوا کرتا تھا کیونکہ جنگ کا مرکز اور ہی جگہیں تھیں۔ البتہ جب ڈن کرک سے انگریزی سپاہی ہمارے اس قصبہ تک پہنچے تو یورپ کی تیز دھوپ کی وجہ سے ان کے چہرے سرخ اور بھورے ہو چکے تھے۔ ہم آپس میں خوب ہنستے تھے کہ انگریز جرمنوں سے مار کھا کر آئے ہیں۔ سب ہندوستانی طالب علموں اور دوسرے ہندوستانی لوگوں کی ہمدردیاں جرمنی کے ساتھ تھیں۔ انگریزوں کے خلاف تھے کیونکہ ہندوستانی انگریزوں کو ہی اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔ شکر ہے کہ جرمن ڈکٹیٹر شپ کا بول بالا نہ ہوا۔ ورنہ ساری دنیا ایک تاریک دور میں آجاتی۔ انگریزوں میں اس قسم کی ڈکٹیٹر شپ نہ تھی جس قسم کی ڈکٹیٹر شپ ہٹلر کی وجہ سے پھل پھول سکتی تھی گویا جرمنوں سے ہمدردی حبِ علیؓ کی وجہ سے نہ تھی بغض معاویہؓ کی وجہ سے تھی۔

موت کے ظالم ہاتھ

سال کے اختتام پر ہمیں تین ماہ کی چھٹیاں ہوئیں۔ پھر ہم لوگ لندن شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لندن شہر تو خطرے سے خالی نہ تھا مگر ہمارے لئے کعبہ ضرور یہ بن گیا تھا۔ میں مسز بیری کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ وہ خوشی سے مجھے اپنے گھر میں جگہ دیتی تھی۔ چاہے اس کو اطلاع دی ہو یا نہ۔ ان چھٹیوں میں میں خوب آوارہ گردی کرتا تھا جو بھی اچھا فلم شو شہر لندن کے کسی کونے میں لگتا جا کر دیکھتا تھا۔ دوستوں کی صحبت میں اچھی گزرتی تھی۔ ویلز کے دورانِ قیام ایک مدراس کے رہنے والے دوست سے بڑی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ان کا نام راجو تھا۔ وہ آندھرا کے رہنے والے تھے اور نہایت ہی مخلص دوست

تھے۔ اس کے ساتھ مل کر ہم بڑی لمبی لمبی سیریں کیا کرتے تھے۔ پھر لندن میں اکٹھے
چلے آئے تھے۔ ٹینس کھیلنے جاتے تھے اور ڈانس کو جاتے تھے۔ فلمیں دیکھنے جاتے تھے
اور کئی قسم کی بدمستیاں کرتے تھے۔ ۱۹۴۱ء کے آخر میں جب میں واپس چلا آیا تو بعد
میں معلوم ہوا کہ یہ دوست راجو صاحب لندن کی ٹھم باری میں فوت ہو گئے۔ جب
میں نے یہ خبر سنی تو میں سری نگر میں تھا۔ مجھے بے حد صدمہ ہوا اور مجھے آج
تک اس کی یاد ستاتی ہے۔ ہری سنگھ بھائی کی یاد بھی کبھی شدت سے آجاتی
ہے۔ ہری سنگھ نے واپس جودھ پور آکر نہ معلوم کس وجہ سے خودکشی کر لی۔
جب اس کے والد نے مجھے اطلاع دی تو مجھے سخت صدمہ ہوا۔ ہری سنگھ
نیک مزاج اور صلح کن تھے۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سخت حساس
تھے۔ اپنے ملک کے خلاف ذرا بھر بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ نہایت ہی
نیک طینت اور نیک سیرت تھے۔ ذکی الدین بھی ان سے اچھی طرح واقف
تھے۔ ذکی الدین ہمارے اچھے دوستوں میں سے تھے مگر بہت خشک مزاج
واقع ہوئے تھے۔ ہم سب میں صرف ذکی الدین اس زمانے میں مسلم لیگ
کے حامی تھے اور اس معاملے میں بڑی اخلاقی جرأت سے کام لیتے تھے۔ اپنے
نکتہ نگاہ کو بدلنے کے لئے کسی صورت میں آمادہ نہ کئے جا سکتے تھے۔ ذکی الدین
آج کل میرے خیال میں نیشنل بنک آف پاکستان میں ملازم ہیں۔ وہ خواجہ شہاب الدین
کے بیٹے ہیں میرے آج بھی ان لوگوں سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ جو لوگ
خواجہ نظام الدین فیملی کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ یہ فیملی راہ و رسم میں کتنی
مخلص اور کس قدر فراخ دل ہے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب جب وزیر اعظم
ہوتے تو ایک بار میری ان سے لڑائی ہو گئی مگر اس کے باوجود مجھ سے پیار
اور محبت سے پیش آتے رہے۔ یقین جانیں کہ شرافت میں ہمارے سیاستدانوں

میں ناظم الدین صاحب سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا صرف شرافت اور دیانتداری میں بے نظیر ہیں، انتظامی قابلیت ان میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ سیاسی فراست تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ سیاسی فراست صرف سہروردی صاحب مرحوم میں تھی۔ جو چالاکی اور ہوشیاری سے زیادہ کام لیتے تھے یہ اتنی اچھی بات نہیں ہے بہرحال اب دونوں بزرگ مرحومین میں شامل ہیں۔ خدا ان کی روحوں کو سکون بخشے (آمین)

ادھورے رُومان

ویلز سے ہمارے کالج کا شعبہ کچھ کیمبرج منتقل ہو گیا اور دوبارہ مجھے ویلز نہ جانا ملا۔ میری دوست (جس کا نام لینا میں ٹھیک خیال نہیں کرتا) شمالی ویلز چکار میں چلی گئی۔ مجھے اس کا صدمہ ہوا۔ پھر میں ویلز جا کر اسے ملا۔ ایک بار وہ کیمبرج آئی۔ اس طرح سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میرا خیال تھا کہ میری اس سے شادی ہو جائے گی۔ مگر متواتر تین سال کی دوستی کے بعد اس نے خود مجھے ایک بار صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ میری بیوی بننے کے قابل نہیں ہے۔ میری حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری کرید نے پر اس نے ساری بات کا تجزیہ یوں کیا کہ میں ایک ایسے ملک کا رہنے والا ہوں۔ جہاں کا ماحول خدا جانے کیا ہے میرے بھائی بہنیں اس شادی کو کیونکر پسند کریں گے۔ بہرحال اصل معاملہ یہ نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی کہ جس قسم کا آدمی میں ہوں اور جو توقعات کہ مجھے ایک عورت سے بیوی بنانے کے بعد ہوں گی۔ شاید انہیں وہ پوری نہیں کر سکتی۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ جس ماحول کی وہ پیداوار ہے وہ ماحول بالکل ہی اور ہے اور جو توقعات میں اپنی بیوی سے رکھ سکتا ہوں وہ ان پر پوری اتر نہیں سکتی۔ مجھے بہت صدمہ۔ مگر آج جب اس واقعہ

پھر بار بار غور کرتا ہوں تو میں جان جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے کس قدر دور رس فکر رکھتی
تھی اور اس کا فیصلہ ہم دونوں کے لئے کس قدر مناسب تھا۔ وہ میرے جذبات
اور احساسات کا مطالعہ کرتی رہی۔ میری ساری شخصیت کا مکمل تجزیہ کرنے کے
بعد اس نے صحیح فیصلہ کیا۔

اس کے بعد ولایت کے باقی دنوں میں میں نے کسی لڑکی سے تعلقات
اس طرح نہ بڑھائے۔ بہر حال صحیح قسم کے تعلقات تو وقت کا سب سے بڑا
تقاضا ہے۔ اس لئے ذہنی عیاشی تو ضرور کی مگر محبت کے جال سے دور دور
ہی رہے۔ مجھے آج بھی بسا اوقات اس لڑکی کا خیال آجاتا ہے اور محض خیال
کے طور پر جب میں گزرے ہوئے واقعات پر نگاہ ڈالتا ہوں تو زندگی کے
اچھے دنوں کی یاد بھی آجاتی ہے۔ سویڈن کے لوگ بھی بڑے دلچسپ ہوتے
ہیں۔ بڑے مہذب مخلص اور سادہ دل انسان اور اس ملک کے طالب علموں
سے بھی میرا بڑا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کی یادیں بھی اکثر آجاتی ہیں۔

انسانی ترقی کا دور

جب کیمبرج میں چلے گئے تو ۱۹۴۰-۴۱ء کا زمانہ تھا اور یہ ہمارا آخری
سال تھا۔ میں نے اور ہری سنگھ نے ایک مکان میں رہائش اختیار کی۔ ذکی الدین
اور سیٹھ صاحب ایک اور دوست کے ساتھ ہی دو الگ مکانوں میں رہنے لگے۔
سیٹھ صاحب قانون میں ہمارے ساتھ ہی تھے۔ بعد میں انہوں نے۔ پی۔
ایچ۔ ڈی کی۔ پھر بمبئی کے ابراہیم دیگدے بھی ہمارے بڑے ذہین دوستوں
میں سے تھے۔ وہ آج کل کراچی میں وکالت کر رہے ہیں۔ کیمبرج میں رہ کر
ہم خطرے کی جگہ میں تھے۔ کیونکہ جرمنی کے جہاز ہر روز کو تری پر بمباری کرنے

جاتے تھے۔ وہاں ہوائی جہازوں کی فیکٹری تھی۔ ایک رات متواتر کوونٹری میں کئی حملے کیے گئے۔ سارا شہر تباہ ہو گیا اور ہم نے سنا تھا کہ ۴۰۰۰ ہزار نعشیں ایک ہی بڑی قبر میں دفنائی گئی تھیں۔ میں نے خود کیمبرج میں ایک سو گز کے فاصلے پر بم ریلوے سٹیشن پر گرتے دیکھے تو زمین پر لیٹ گیا۔ لندن میں کئی بار ہوائی حملے ہوتے ہوئے دیکھے۔ شروع میں تو ہم بہت ڈرتے تھے مگر رفتہ رفتہ بعد میں عادت پڑ گئی تو پھر زمین دوز غاروں میں بھی جانا چھوڑ دیا اور ٹوکل پر ہی رہنے لگے۔

جنگ نے سارے انگلستان کے لوگوں میں وہ جو رجعت پسندی کا پردہ تھا اسے پھاڑ دیا اور آپس میں دوستانہ زیادہ بڑھنے لگا۔ ایک نیا نقطۂ نظر پیدا ہونے لگا جو مشترکہ دشمن کے ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ پھر جب آگے پیچھے موت ہی موت دکھائی دیتی ہو تو معمولی قسم کے تعصبات کی کون سوچ سکتا ہے۔ چنانچہ جنگ میں کام کرنے والے لوگوں کی آپس میں دوستیاں عام ہو گئیں۔ پھر بہت سے لوگ جب جنگ میں چلے گئے تو ان کی عورتیں پیچھے رہ گئیں۔ اس وجہ سے بھی راہ و رسم کھلی ہو گئی۔ ڈانس ہال میں مرد کم اور عورتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ اچھے ڈانس کرنے والے سے خوشامد کر کے عورتیں ڈانس کرتی تھیں۔ مگر حبشیوں کو پھر بھی حقارت سے عورتیں اور مرد دیکھتے تھے۔

لیکن جب میں ۱۹۴۸ء میں سلامتی کونسل جاتے ہوئے لندن میں ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ اب وہاں حبشیوں سے قدرے بہتر سلوک ہوتا ہے اور وہ ڈانس وغیرہ میں بھی شرکت کر سکتے ہیں۔ یہ محض جنگ کے بعد کی ترقی تھی یا پھر جنگ کا ردعمل! ۱۹۳۸ء میں جب میں پڑھنے گیا تھا اور آج ۱۹۶۰ء میں اتنا فرق ہے کہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں میں زیادہ رجعت پسندی ہو مگر انگریزوں کے نظام زندگی سے رجعت پسندی ختم ہو رہی ہے جو اچھی بات ہے۔ جنگ کی

وجہ سے عوام کے ہر شعبہ زندگی میں جو جو انقلاب آئے اس کا احساس ساری دنیا کو ہے اور اس جنگ نے لوگوں کو یکسر بدل دیا ہے۔ ایٹم بم کے بے مثال دور کا آغاز اسی جنگ سے ہوا ہے۔ پھر روس کا چاند تک راکٹ چھوڑنا حیرت انگیز انسانی عقل کی ترقی ہے۔ یہ محض ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء کی جنگ کے کرشمات ہیں یا انسانی ذہن کا ارتقاء۔

میں ہمیشہ اپنی جگہ تو بڑی شدت سے اور فخریہ طور پر محسوس کرتا ہوں کہ جس دور میں ہم پیدا ہوئے اور مر بھی جائیں گے وہ انسانی ترقی کا بہترین دور ہے اور جب میں خیال کرتا ہوں کہ میرے والد کا دور کس قدر پیچھے تھا اور میرا دور کس قدر ترقی گیا اور مجھے خوشی بھی محسوس ہوتی ہے اور یہ خفیف سی پریشانی بھی کہ فرق صرف چالیس پچاس سال کا ہے مگر دونوں دور کس قدر مختلف ہیں۔ بعض اوقات یہ فخر بھی ہوتا ہے اور شاید بجا طور پر ہوتا ہے کہ میرے بچے اس سے بھی شاندار دور سے گزریں گے۔ اگر دنیا اپنے آپ کو ایٹم بم کی جنگ سے کسی بھی طریق سے محفوظ کر لے تو انسانی ترقی کے مدارج کس قدر بلند اور عالی شان ہو سکتے ہیں۔ اتنی ترقی کرنے کے باوجود اور اس قدر قدرتی طاقتوں پر فتح پانے کے باوجود، انسان نے اپنے خود غرضی کے جذبات پر قابو نہیں پایا۔ اور اپنے نظم و ضبط سے چھٹکارا پا کر فوراً انسان انسان کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس انسانی فتح کی دور میں اخلاقی طور پر انسان کس قدر گر چکا ہے۔ یہ پریشانی کی بات ہے۔ انسان پر حیوانیت کا عنصر طول آگے سے بڑھتا جاتا ہے گھٹتا نہیں ہے اور بڑی مایوس کن صورت حال یہ ہے کہ انسان محض بلند دعاوی کا عادی ہو چکا ہے بلکہ زیادہ ریاکاری اور بین الاقوامی ڈپلومیسی سے کام لینے کا عادی بن رہا ہے۔ آہستہ آہستہ انسان کے درمیان سے پیار اور اخلاص و دیانت کے

نیک جذبات اُبھتے جا رہے ہیں۔ دین کی قوت انسانوں سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مادی دُنیا کا لالچ انسانوں کو اپنی طرف مقناطیس کی مانند کھینچے جا رہا ہے مگر دونوں کا خوشگوار امتزاج ہو سکتا تھا اور انسانوں کی دنیا سے ایک دوسرے کی نفرت ختم ہو سکتی تھی۔ باہمی محبت کے رشتے خوش اسلوبی سے قائم ہو سکتے تھے۔ کاش کہ ایسی کوئی تحریک موجودہ دور میں پنپ سکے۔

کیمبرج یونیورسٹی کا ماحول

کیمبرج ایک خوب صورت شہر ہے۔ اس کے درمیان سے ایک ندی بہتی ہے جسے وہ حسن ظن سے دریا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ دریا اگر دیکھنے ہوں تو مشرقی پاکستان میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ادھر ادھر جھیل جوڑے دریا ہوتے ہیں۔ کبھی سمندر کی طرف بہنے لگتے ہیں۔ کیمبرج کی اس خوب صورت ندی کے دونوں کناروں پر نازک بید مجنوں کے درخت ہیں۔ جو ہوا کے معمولی جھونکوں سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اور حسین و جمیل دوشیزہ کی مانند اپنے بدن کے حصوں کا بے تکلفی سے بڑا دلچسپ مظاہرہ کرتے ہیں۔ غالباً اس میں کوئی کشش ضرور ہے۔ یہ درخت اس ندی کی خوب صورتی کو اور بھی پیار سے سنوارتے ہیں۔ اگر چاندنی رات میں یہاں چلے جائیں اور اس کے کنارے کسی عزیز دوست کے ساتھ سیر کرتے رہیں تو جنت کا تصور سامنے آجائے گا۔ میں نے کئی بار ایسے کیا۔ کئی حسین اور چاندنی راتیں مجھے اس دلنشین شہر کیمبرج کی اس ندی کی یاد ہیں اور ان کی یاد بڑی پیاری ہے۔ اسی ندی کے کنارے لاہور کے میاں بشیر احمد کے صاحبزادے کشتی پر سے ڈوب گئے تھے۔ ہم کیمبرج میں پڑھائی کی طرف زیادہ متوجہ تھے کیونکہ پڑھائی کے لئے اس

شہر سے زیادہ موزوں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ خوب صورت لائبریریاں موجود ہیں اور ہر قسم کی کتاب چٹ لکھ دینے سے ایک منٹ کے اندر آپ کی میز پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ کام بڑے سلیقہ اور اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ یہاں طالب علم ہونا بھی ایک عیاشی ہے۔ آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پروفیسر آپ کو ادب سے بٹھاتے ہیں۔ آپ میں برابری کے تعلقات ہوتے ہیں۔ استاد اور طالب علم کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا اور اگر آپ اچھے طالب علم ہیں تو اپنے آپ کو اس شہر کی کائنات پر چھایا ہوا محسوس کریں گے۔ یہاں ہر چیز کا معیار بلند ہے اور یہیں میں نے قانون کی کتابوں میں گم ہو جانے کے علاوہ موسیقی کا ذوق پیدا کیا، اپنے خیالات کو پختہ کیا۔ سیاسیات اور علم نفسیات پر علم و تجربہ حاصل کیا۔ ان دنوں کی یاد کس قدر خوب صورت ہے۔ میری عمر اس وقت پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ تھی مگر مجھ میں اعتماد اس قدر پیدا ہو گیا۔ دنیا فتح کرنے کو جی تلملاتا تھا۔ جو حجابات یا جو اخلاقی پابندیاں غیر ضروری تھیں۔ وہ خود بخود مٹ گئیں۔ پھر یہ کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ایک انسان دوسرے سے محض ہندوستانی ہونے کی وجہ سے کمتر ہے۔ کیمبرج کے اس آزاد ماحول نے تمام احساسات کمتری ختم کر دیئے جو محض صحیح علم و تجربہ کی وجہ سے ہو سکتا ہے صحیح علم و تجربہ صرف ایسے ماحول میں ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ محض لائبریری میں بیٹھ کر بڑی بڑی کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے اس ماحول کی آب و ہوا خود بخود ایسے احساسات جذبات کی پرورش کرتی جو بلند ہونے کے علاوہ گہرے اور دوررس ہوتے ہیں۔

یہ ماحول کچھ اس وجہ سے بھی آسانی سے بن گیا کہ جس قوم نے ہم ہندوستان والوں کو تباہ کر رکھا تھا اس کی تذلیل ہوتے بھی دیکھی۔ ان سرول

کو بھی خم کھاتے ہوئے دیکھا جو صرف آسمانوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ آقاؤں کو ان کے اپنے ہی ملک کے اندر بے حد پریشانی میں دیکھا۔ ان سے دشمنی کی بجائے ہمدردی بھی پیدا ہوئی اور اب ان میں وہ رعونت، وہ شہنشاہیت ختم ہو گئی۔ ڈن کرک کے سمندر کے کناروں نے وہ چنگیزی مٹی میں ملا دی تھی۔ اب وہ ہم سے آنکھ ملانے سے کتراتے تھے۔ جرمن ریڈیو سے روزانہ ان معاملات کی تفصیل سن کر اپنے دل کی تسلی ہو چکی تھی۔ اگرچہ کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں میں بڑی رواداری ہوتی ہے۔ بلکہ معمولی اور گھٹیا قسم کے تعصبات کا مظاہرہ پہلے بھی کم ہوتا ہو گا۔

میں نے قانون کے دونوں امتحان یک جا دیے۔ ایل ایل بی کا اور بیرسٹری کا امتحان ایک ہی ماہ میں ہوئے۔ یہ نہایت ہی مشکل معاملہ تھا۔ میرے ساتھ کے سارے طلباء پاس نہ ہو سکے تھے۔ ان میں ذکی الدین۔ ہری سنگھ اور یار محمد خان وغیرہ شامل تھے۔ بہر حال میں نے دونوں امتحان پہلی ہی بار پاس کر لیے۔ میں کسی غیر معمولی لیاقت کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ میں نے بے حد اور صحیح محنت کر رکھی تھی۔ اور محنت سے دنیا کے سب کام حل ہو جاتے ہیں۔ ایل ایل بی کے پچھلے دس سالوں کے سارے پرچے پوری طرح اپنی قلم سے حل کر رکھے تھے۔ اس لئے لکھنے میں مجھے ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اگر سب طالب علم امتحان سے ایک ماہ پیشتر اپنی کتابیں چھوڑ کر محض لکھنے پر زور دیں اور اپنی عادت لکھنے کی مکمل بنا لیں۔ تو تمام امتحانوں کا مسئلہ بہت ہی آسان ہو سکتا ہے اگرچہ ہر ایک کا طریقہ کار اپنا اپنا ہوتا ہے۔ مگر اس تجربے کو نہایت ہی کامیاب سمجھتا ہوں۔ امتحان کی کامیابی پر میں نے اپنے گھر والوں کو پہلی بار ایک سال بعد بذریعہ کیبل اطلاع دی۔ جو خوشی کی اطلاع بھی تھی اور میری محنت کا ثمر بھی۔

سرزمین وطن کی طرف واپسی

امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے اپنے وطن کے لئے سمندری جہاز پر جگہ ملنی بڑی مشکل تھی کیونکہ دوران جنگ مسافروں کے لئے بہت کم سہولت رہ جاتی ہے۔ انڈیا ہاؤس جاکر اپنا نام درج کروا دیا۔ خیال تھا کہ راستہ ایک سال کے بعد ہی ملے گا اور ارادہ کیا کہ اتنے عرصہ میں کیمبرج جاکر انگریزی کی ڈگری کے لئے داخلہ لے لوں۔ مگر داخلہ لینے سے پہلے ہی میرا خوش قسمتی سے واپسی کا انتظام ہو گیا۔ سٹی اینڈ ہال لائین کا جہاز سٹی آف قاہرہ چھوٹا سا جہاز تھا۔ جس پر واپسی کے لئے نشست مل گئی۔

سب دوستوں نے مجھے لندن میں ہی رخصت کر دیا۔ سارا اپنا سامان وہاں ہی چھوڑنا پڑا۔ لائبریری جو میں نے اپنے روزانہ خرچ کے پیسے بچا کر اکٹھی کی تھی وہ بھی وہاں ہری سنگھ کے حوالے کرنا پڑی۔ چند کتابیں ساتھ لیں ان کو بھی پہلے سنسر والوں کی خدمت پیش کرنا ضروری تھا۔ کئی دوستوں نے مجھے اس سفر کے خطرات سے آگاہ کیا۔ ان دنوں جرمن آبدوز کشتیاں بڑے جہاز ڈبوتی تھیں۔ مگر اب جبکہ مجھے راستہ مل گیا تھا تو اسے چھوڑنے کو میری طبیعت نے نہ مانا۔ پھر میرے پاس اس قدر پیسے بھی نہیں رہ گئے تھے کہ میں ولایت میں ہی بیٹھا رہتا۔ میں نے اسی لئے مناسب سمجھا کہ خطرات کے باوجود بھی مجھے اپنے وطن واپس چلے جانا چاہیئے۔ یہ فیصلہ کرنے میں مجھے کوئی اتنی بڑی دقت پیش نہ آئی۔

سب ضروری کاموں کی انجام دہی کے بعد میں نے اپنی تیاری مکمل کر لی اور ایک بارش والے دن لیور پول کی گاڑی میں لندن سے سوار ہو گیا۔

جب سٹیشن سے گاڑی چھوٹی تو ہری سنگھ جو (طبیعت کے بڑے کمزور واقع ہوئے تھے) رو پڑے تھے۔ ہری سنگھ میرے اچھے اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ لیورپول پہنچ کر علم ہوا کہ ہمارے ساتھ سو کے لگ بھگ مسافر ہیں جن میں زیادہ تر عورتیں ہیں جو ہندوستان اور ہانگ کانگ تک جا رہی ہیں۔ ابھی جاپان نے اعلانِ جنگ نہیں کیا تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ ہمارے جہاز کے ساتھ سو کے قریب دوسرے سامان بردار جہاز بھی ہیں۔ پہلے ہم لوگوں نے اٹلانٹک عبور کر کے کینیڈا کچھ سامان چھوڑنا تھا اور پھر وہاں براستہ افریقہ ہندوستان کا سفر طے ہونا تھا۔ یہ پورے تین ماہ کا سفر تھا۔ جب جنگی خطرات کا احساس ہوا تو طبیعت مرجھا سی گئی آخر یہ طویل سفر کیسے طے کروں گا۔

جہاز پر جرمنوں کا حملہ

جب جہاز چل پڑے تو اسی دن جرمن ہوائی حملہ ہوا اور ہمارے اس قافلے میں سے تین جہاز ڈوب گئے۔ ان جہازوں کے چلانے والے بھی ہمارے ساتھ تشریف لے آئے۔ اس سے ہم اور بھی پریشان ہوئے یہ تو دن کو ہوا۔ پھر اسی رات کو جرمن آبدوز کشتیوں نے حملہ کیا۔ اس حملے میں ہمارے تین اور جہاز ڈوب گئے۔ ان جہازوں کے چلانے والے بھی ہمارے ساتھ تشریف لے آئے۔ ہم مزید پریشان ہوئے۔ جب یہ باتیں ہم مسافروں میں پھیلنے لگیں تو یہ بھی علم ہوا کہ ہمارے ساتھ کچھ ایسے مسافر بھی ہیں جو پہلے ڈوبے جہازوں سے بچ کر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ خبر برداشت سے بھی اوپر ہو گئی۔ کیونکہ اس خبر کے ساتھ یہ بھی پھیلایا گیا یا خود پھیل گیا کہ یہ بہت ہی برا شگون ہے۔ بعد میں ہمیں ان لوگوں کے نام بھی معلوم ہوئے۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ پہلی تین راتیں ہم جان بچاؤ ورڈ چکر سے پہن کر بیٹھے رہے
لیٹنے کا حکم نہ تھا سارے جہازوں میں بلیک آؤٹ تھا۔ اس جہاز پر چھوٹے
چھوٹے دو تین بچے بھی تھے۔ ایک عورت تھی جس کے ساتھ ایک چھ
سات سال کی بچی تھی۔ اس کا کوئی اور وارث یا واقف نہ تھا۔ وہ کلکتہ اپنے
خاوند کے پاس جا رہی تھی۔ ایک دوسری عورت تھی جس کا بچہ ابھی سال
کا بھی نہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہمدرد اور وارث جلدی ہی جہاز پر بنا لئے تھے
کچھ نرسیں تھیں۔ جو مانگ کانگ جا رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ مست رہتی تھیں۔ ان
مسافروں کے جم گھٹے میں ہم ہندوستانی طالب علم دس بارہ تھے۔ باقی چالیس
پچاس عورتیں تھیں۔ انگریز مرد بہت ہی تھوڑے سے تھے۔ ان میں مذہبی قسم
کے لوگ یعنی پادری وغیرہ ہی زیادہ تھے۔ انہیں عورتوں سے زیادہ سروکار نہ تھا
کچھ چند نوجوان تھے جن کو سیلون والی دو عیسائی ڈاکٹروں سے جو واپس آ رہی
تھیں۔ سے بہت دلچسپی تھی مگر اپنے رنگ کی انگریز عورتوں سے خدا
جانے کیوں کتراتے تھے۔

ایک ماہ یہ جہاز خطرناک سفر میں رہا۔ جب باقی جہازوں کو چھوڑ کر اس
جہاز کا منہ افریقہ کے شمال کی طرف ہوا تو اسے خطرے سے باہر بتایا گیا
اور روشنی بھی جہاز پر رات کو ہونے لگی۔ سب سے پہلی بندرگاہ جہاں ہم
نے ڈیرے ڈالے وہ شمالی افریقہ کی ایک بندرگاہ تھی جس کا نام نارتھ ٹاؤن
ہے یہاں گرمی تھی جبکہ تمام اٹلانٹک سمندر میں سخت سردی تھی۔ اس
سمندری قصبے میں مچھر بہت تھے۔ لہذا رات کو باہر سونے کے سوا کوئی
چارہ کار نہیں تھا۔ مگر مچھر اس قدر تنگ کرتے تھے کہ سونا محال تھا۔ جہاز
کو یہاں سے سامان اور ضروریات لادنی تھیں۔ یہ چھوٹا سا غیر دلچسپ قصبہ

کوئی سامانِ آرائش مہیا نہ کر سکتا تھا اور یاد رہے کہ ہم مسافروں کو ولایت سے رخصت ہوتے وقت صرف دس پونڈ کی قلیل رقم ساتھ لے جانے کا حکم تھا۔ خدا خدا کر کے یہاں سے مخلصی ہوئی اور تین دن ٹھہرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہوئے۔ جب میں ۱۹۶۴ء میں کشمیر کے وفد کے ممبر کی حیثیت سے افریقہ کے سفر پر آیا۔ اس شہر میں تین دن قیام کیا۔ اب یہ ایک آزاد ملک ہے اس کا نام سیرالیون ہے مگر یہ شہر اسی قدر غیر دلچسپ ہے جتنا کہ ۱۹۴۲ء میں تھا۔

اسی دوران میں کرسمس اور نئے سال کے دن آگئے۔ چونکہ مسافروں کی بڑی تعداد عیسائیوں کی تھی اس لئے کرسمس میں سے بڑی چہل پہل شروع ہوئی یہ چہل پہل بھی بہت دلچسپ تھی کیونکہ ہم جنگ کے خطروں سے اب آزاد ہو چکے تھے اگرچہ جاپان نے اعلان جنگ ہمارے جہاز کے سفر کے دوران کیا تھا۔ لہٰذا ماہرین کا خیال تھا کہ آبدوز کشتیاں بحر ہند میں ہو سکتی ہیں۔ ہم لوگ ہر روز جہاز کے اوپر رات کو ڈانس کرتے تھے۔ کبھی رات کے دو بجے تک یہ شغل لگا رہتا تھا۔ چونکہ مردوں کی ناقابلِ تلافی کمی تھی۔ اس لئے ہم طالب علم لوگ ڈانس کے معاملے میں کچھ آگے ہی رہتے تھے اس سفر کے دوران ہماری واقفیت اور راہ و رسم بڑھتی گئی۔ جہاز کے اوپر ڈاک ٹینس کا کھیل بھی عموماً شام کو کھیلا کرتے تھے اور دن کے وقت کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ جہاز پر صرف فرسٹ کلاس کے لوگ تھے۔

کرسمس کا انتظام بڑے چاؤ اور شوق سے کیا گیا ہم سب نے تفریح طبع کے لئے اور صحت کے تقاضا کے تحت ان تقریبوں میں حصہ لینا شروع کیا دوران جنگ اور دوران سفر سب پابندیاں انسانوں کے لئے محض تکلفات ثابت ہوتی ہیں۔ جب جان کا خطرہ ہر وقت لاحق ہو تو آپس کے مذہب و ملت

اور قومیت کے سب تفرقے ختم ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑا جانی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو تمام معمولی تعصبات اور تفریقات ختم کر دیتا ہے۔ فطری طور پر ہم نے اپنی قسمت پر سارا معاملہ چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے بس کی کوئی بات نہ تھی۔ اگر سمندر میں مرنا ہے تو کوئی چارۂ کار نہیں۔ جب قدم سفر کے لیے رکھا تھا تو اس قدر خطرے کا احساس اچھی بات ہی نہ تھا۔ جب خطروں سے دو چار ہو گئے تو پھر اس قدر خطرے سے مرعوب نہ تھے۔ اور وہ ذہنی طوفان پیدا ہو کر اپنی موت کئی بار مر چکا تھا۔ اب ہمارا رویہ تھا کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

کرسمس کی شام بڑی دلچسپی سے گزری۔ اپنی تمام پابندیوں کو خیر باد کہہ کر سب نے عیش کئے۔ جو عیش سب کو اپنی اپنی جگہ نصیب ہو سکتے تھے کئی ایسے بھی تھے، جو عورتوں کے نزدیک جانے سے گھبراتے تھے۔ حالانکہ چار چار سال ولایت رہ کر آئے ہوئے تھے۔ بنگال کے ایک لاہیری صاحب تھے جو عورت کی شکل سے پریشان ہوتے تھے۔ جنہیں عورت کے سامنے پسینہ آنے لگتا تھا۔ مگر شغل عورت کے سوا اور بھی تو ہو سکتے ہیں۔ وہ دن بھر ڈک ٹینس اور دوسری کھیلوں میں مصروف رہتے تھے اور شام کو تھک کر اپنے کمرے میں آتے ہی بستر پر مریض کی طرح مایوس سے ہو کر لیٹ جاتے تھے۔

میں بحیثیت ایک ایکٹر

اس سفر میں میرے ساتھ ایک عجیب حادثہ ہوا۔ جس نے میری زندگی پر نہایت ہی فیصلہ کن اثر ڈالا۔ ہوا یہ کہ انگریز لوگوں نے نئے سال کے لئے ایک ڈرامہ کی تیاری شروع کی۔ یہ تیاری کرسمس سے قبل کئی دنوں سے شروع ہوئی۔ اس میں مرد کا پارٹ انہوں نے زبردستی باوجود سو بہانوں اور

جیلوں سے کے مجھے دیا۔ میرے لئے اس سے بڑا طوفان کیا نازل ہو سکتا تھا۔
میں تقریر سے کوسوں بھاگتا تھا۔ تقریر کا محض خیال مجھے پسینے میں شرابور کر
دیتا تھا۔ اپنا پارٹ اس ڈرامہ میں یاد کر کے پھر ایک پارٹ ادا کرنا میرے لئے
تو قیامت تھی۔ پہلے ہی سے اپنا پارٹ پڑھا۔ مجھ میں بڑی کمزوری یہ ہے کہ
کسی چیز کو رٹ کر یاد کرنا میرے لئے بڑی مصیبت ہے۔ مجھ میں وہ خاصیت
یا قابلیت ہی نہیں ہے جس کے بل بوتے پر لوگ سطور زبانی رٹ لیتے ہیں۔
مجھے رٹنے سے سخت نفرت ہے۔ نہ ہی کچھ رٹ سکتا ہوں اس لئے جیومیٹری
کے رٹنے والی چیزوں سے میں میٹرک کے دوران دور بھاگتا تھا یا کیمسٹری کے
فارمولا قسم کی چیزیں مجھے خواہ مخواہ سر درد میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

ایک دو بار پڑھنے کے بعد میں اپنا پارٹ جا کر اس انگریز کو جو اس ڈرامہ
کے انچارج تھے واپس کر کے چپکے سے واپس آگیا۔ اسے جب یہ پتہ لگا تو
وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے گھنٹہ بھر بیٹھ کر میرے ساتھ یہ درد سری کی کہ مجھ میں وہ
چیز موجود ہے جو ایک ایکٹر کے لئے ہوتی ہے۔ میں حیران ہوا کہ یہ صاحب
کیسے پاگل پنے کی باتیں کرتا ہے۔ اس نے اپنی پوری قوت صرف کر کے مجھے
پھر مجبور کیا کہ میں کم از کم وہ پارٹ یاد تو کر لوں۔ پھر وہ سنے گا نتائج ٹھیک نہ
ہوئے تو پھر اور فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ یہ ڈرامہ انگریز لوگوں
اور ہندوستانی لوگوں سے ملا جلا پیش کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی طالبعلموں
میں اپنے لباس اور شکل و شباہت میں ہی انہیں موزوں نظر دکھتا تھا۔ میں
ان سے گھل مل بھی گیا تھا۔ جو عورت میرے خلاف پارٹ ادا کر رہی تھی ایک
صاحب ثروت عورت تھی اس نے محض میرے لئے اپنی رضامندی دی تھی
ان باتوں کا علم مجھے کلکتہ پہنچ کر جب کہ سفر اختتام پر پہنچا ہوا تھا۔ ساری دنیا

کے دھندے چھوڑ کر میں نے اپنا پارٹ یاد کرنا شروع کر دیا۔ یہ لمبا سارا قصہ تھا۔ ایک گھنٹے کا، پھر مختلف اوقات پر مجھے سٹیج پر جانا تھا۔ ڈرامے کا سارا سامان اس جہاز پر تھا۔ سب جہاز اس قسم کا سامان رکھتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ آج کل سمندری جہازوں کا سفر کرتے ہیں۔ وہ دوران سفر تفریح کرتے ہیں۔ جہاز والے انہیں بے حد خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے سفر کی مقبولیت نے سمندری جہازوں کا سفر کرنے والوں میں شایقین بھی کی ہو۔

بالآخر وہ دن بھی آ پہنچا۔ جب یہ ڈرامہ ہونا تھا۔ کئی بار ہم نے ریہرسل کی اس کی پھر بھی مجھے یقین تھا کہ اس پارٹ کے سارے الفاظ مجھے اس وقت بھول جائیں گے۔ چنانچہ یہ خصوصی انتظام بھی ہوا کہ سٹیج کے ایک طرف ایک صاحب کھڑے ہو کر مجھے ہر وقت لقمہ دینے کے لیے تیار بھی رہا کریں گے۔ میری کیا کیا ناز برداریاں ان لوگوں نے کیں۔ محض ڈرامے کو دلچسپ بنانے کے لیے اٹھارویں صدی کے خاوند کا پارٹ میرے ذمہ تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں لگا کر اور عجب قسم کی ٹوپی پہن کر اور پتلون ٹانگوں سے لگی ہوئی پہننا مونچھیں باقاعدہ لگائی جاتی تھیں۔ جب وہ شام سر پر آ ہی گئی تو میں نے بڑی کر ہمت باندھی۔ بالآخر یہی ہو گا کہ درمیان میں قصہ فیل ہو جائے گا۔ کوئی موت کی سزا تو نہیں ہے۔ یہی ایک دو روز لوگ ہنسیں گے۔ پھر معاملہ بھول جائیں گے۔ یہ بحث تو اپنے دل کی تسلی کے لئے میں اپنے ساتھ کرتا رہا۔ اپنے کمزور دل کو سہارے دیتا رہا مگر جوں جوں وقت نزدیک آتا تھا مجھے تمام پارٹ بھولتا جاتا تھا۔ سر میں چکر سے آنے لگے۔ پھر پارٹ کا کوئی کوئی لفظ یاد رہنے لگا۔ مگر تسلسل ختم ہو گیا تھا۔ ایک صاحب نے پورے دو گھنٹے صرف کر کے مجھے ڈریس کیا۔ مونچھیں لگائیں۔ سارا لباس پہنوایا۔ لباس پہنوا کر بہت ہی ہنسا اور کہنے لگا تم واقعی اچھا کام کرو گے۔ میں نے اسے کہا کہ میری جگہ بولے گا کون میری تو ٹانگیں جواب دیتی جا رہی ہیں۔ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ میں محض

تفنن کے طور پر ایسی باتیں کرتا ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ ویسے باتیں کرنے میں مجھ میں اتنا حجاب نہ تھا ویسے باتیں کرنا الگ معاملہ ہے مگر ڈرامہ ایک ایکٹر کی حیثیت سے ادا کرنا اور ہی طوفان ہے!

آخر جب میری باری آپہنچی۔ ہال بھر چکا تھا۔ کم و بیش دو سو انسان بیٹھ چکے تھے ساتھ سکے جہاز سے ایک ایڈمرل صاحب اور ان کی خوب صورت بیٹی بھی تشریف لائی ہوئی تھیں۔ مگر ان کا ڈر اتنا نہیں تھا جتنا ان چہروں سے طبیعت گھبراتی تھی جنہیں دیکھ چکے ہوئے تھے۔ وہ نہیں گے پھر کیا دل میں سوچیں گے۔ یہی خیال محض کھائے جا رہا تھا۔

جب میری باری آئی اور کسی نے مجھے پیچھے سے زور کا دھکا دیا۔ تو میں سٹیج پر تھا۔ میری آنکھوں نے صاف صاف کسی کو نہ دیکھا۔ نظر صاف ابھی کچھ نہ رہا تھا۔ دھیمی سی اور مدہم سی شکلیں بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ان شکلوں میں کون کیا ہے مجھے پتہ ہی نہ لگتا۔ میرے شروع کے الفاظ پیچھے والے نے فوراً بول دیے۔ باقی الفاظ مجھے یاد آ گئے۔ پہلے دو منٹ میرے لئے قیامت گزری۔ پھر الفاظ خود بخود آنے لگے۔ میں نے ساتھ ساتھ اچھی طرح اپنا پارٹ ادا کرنا شروع کر دیا۔ کوئی ہنسا نہیں، کچھ نہ ہوا اور میں اعتماد حاصل کرتا گیا۔ پھر سارا پارٹ خوب صورتی کے ساتھ یاد آتا گیا۔ جیسے مجھے کوئی مشکل تھی ہی نہیں۔ طبیعت اس طرح کھل گئی کہ میں محسوس کرنے لگا کہ طوفان سر سے ٹل چکا ہے۔ سارا پارٹ ادا کیا۔ ایک ایکٹ ادا ہوا۔ دوسرا بھی ہو گیا۔ فائنل کی جب باری آئی تو کافی اعتماد ہو چکا تھا مجھے فوراً کسی خیال نے پریشان کر دیا۔ الفاظ بھول گئے کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ میں نے وہ سب کچھ چھوڑ کر جو منہ میں آیا وہ کہہ دیا اور خوب اپنی مونچھیں گھمائیں۔ تمام حال میں شور مچ گیا اور ہنسی اور لطف سے لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے

میں فوراً وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ ساری رات نیند تک نہ آئی۔

صبح جب ناشتے پر گیا تو سارے لوگوں نے مجھے مبارک باد دی اور کہا کہ مجھ میں ایک قدرتی ملکہ ہے۔ اچھا ایکٹر بننے کا مجھے اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر ایک گونہ تسلی ہوئی۔ اپنے اوپر ایک فتح نصیب ہوئی۔ اور میں نے سوچا کہ میں اپنے ہی جذبات اور غیر فطری احساسات کے رعب میں آچکا تھا ورنہ تقریر کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے صرف پہلے دو منٹ جو گزار لے وہ مقرر ہو گیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ خیال ہی نہیں کرنا چاہیئے کہ سامعین بھی کچھ جانتے ہیں یا ان کے کچھ اس معاملے کے متعلق خیالات ہیں۔ اپنے موضوع کو ٹھیک سوچ لیں پھر سامعین کو درخت سمجھیں یا بکریاں خیال کریں ایک ہی بات ہے۔ بیباک طریق پر وہ کہہ دیں جو آپ سوچ کر آئے ہیں کامیابی یقینی آپ کی ہے۔ جو لوگ تنقید کریں گے وہ تقریر کے بعد یہ سوچ کر کہ تقریر کرنے والے نے کیا کہا ہے ہی کریں گے اور اس وقت آپ کا وقت ختم ہو گیا ہوتا ہے اور مشکل کا وقت گزر ہو چکا ہوتا ہے۔

فنِ تقریر

جب ہم نے ۱۹۴۸ء میں سلامتی کونسل میں ایک سو پریس کے نمائندوں سے خطاب کیا تو میری عمر ۳۲ سال کی تھی اور میرے لئے یہ مہم سکندر اعظم کی فتح سے کیا کم تھی! جب پریس والے خود سخت تنقیدی رویہ رکھتے ہوں اور کوئی ہمدرد نہ ہو تو پارلیمنٹ میں تقریر کرنا آسان ہے مگر پریس کانفرنس بے حد خطرناک اور نازک معاملہ ہوتا ہے۔ اس وقت میری حیثیت کسی نے تسلیم نہ کی تھی۔ آزاد کشمیر کی حکومت کو کون سمجھتا تھا۔ سارا نیو یارک کا یہودی پریس اور نمائندے

پاکستان کے خلاف اس لئے ہو چکے تھے کہ سر ظفر اللہ خاں صاحب نے فلسطین کے مسلمانوں کی حمایت کی تھی اپنی پریس کانفرنس میں پسینہ پونچھنے کی سٹیج سے گزر گیا اور روانی حاصل ہو گئی تو پیچھے سے ایک لڑکی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"گھبراؤ مت تمہاری تقریر بہت اچھی ہے"۔

سلامتی کونسل سے جب واپس لاہور آیا تو لاہور یونیورسٹی کی پولیٹیکل سوسائٹی نے مجھے تقریر کی دعوت دی۔ اس میٹنگ میں یونیورسٹی کے بہت سے طلباء تھے۔ دوسرے دن اخباروں نے لکھا کہ میری تقریر میں فنِ تقریر معراج تک پہنچ چکا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں اگر مجھے یونیورسٹی کے ایک کمرے میں دو طالب علموں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کوئی کہتا تو مجھے قیامت نظر آتی۔ میرا اپنے متعلق یہ خیال تھا کہ میں تقریر کرنے والوں میں سے پیدا ہی نہیں ہوا ہوں مگر اپنے اس خیال اور عقیدے پر مجھے زندگی میں شاندار فتح حاصل ہوئی اور جب ۱۹۵۵ء میں کراچی میں کشمیر پر ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب ہوئی تو اس میں سہروردی صاحب نے بھی تقریر کی تھی اور سارے پاکستان کے چوٹی کے لیڈر اس میں شامل تھے اور مجھے چودھری محمد علی صاحب نے (جو اس وقت وزیراعظم تھے) یہ کہا کہ میری تقریر سب سے بہترین تھی۔ یہی بات مجھے سہروردی صاحب نے بھی کہی۔ سہروردی صاحب نے اپنی تقریر اردو میں کی تھی۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار انگریزی میں کیا تھا اور میری تقریر آدھ گھنٹے میں ختم ہو گئی تھی۔ یہ تقریر میں نے اپنے سٹینوگرافر کو ہوٹل میں لکھوائی جو اس نے ٹائپ کر دی اور میں نے صرف دو دفعہ یہ تقریر پڑھ لی تھی۔ مجھے اب اپنی ذات پر تقریر والے معاملہ میں بہت اعتماد ہے۔

چاندنی راتیں

الغرض کرسمس کے واقعہ کے بعد جہاز پر میرا وقت دلچسپ گزرا۔ چاندنی راتوں کے دو مہینے جہاز پر ہم زندگی کے لطف میں کھوئے رہے۔ کس خوبصورتی کے ساتھ چاند چڑھتا تھا۔ سمندر کی لہروں پر چاندنی سانپ کی طرح بل کھاتی تھی۔ کسی دوست کے ساتھ کھڑے ہو کر میں بڑی دیر تک ان لہروں کو دیکھتا رہتا تھا۔ زندگی کے بہترین ایام اس جہاز کے سفر کی یاد ہیں اور یہ تو پوچھیے کہ سمندر نے بغیر شکایت کئے ہمارے کیا کیا راز اپنی گود میں لئے اور اتھاہ گہرائیوں میں دبا دیے۔

جنوری کے آخر میں ہمارا جہاز آکر ہگلی دریا کے منہ میں کھڑا ہو گیا۔ میرا سفر کولمبو تک تھا۔ دوستوں نے مجبور کیا تو ہم سیدھے کلکتہ چلے گئے۔ ہگلی دریا کے منہ کے سامنے ایک ہفتہ تک جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ہم سب انتظار میں رہے آخر با دلِ نخواستہ اس جہاز کے ساتھیوں کو الوداع کہی۔ اور وہ خوب صورت واقعات جو اس جہاز میں دوچار ہوئے۔ اسی جہاز کے سپرد کر دیے۔ کلکتہ میں اتر کر سگریٹ پینے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیے اور عہد کیا کہ ہر وہ شے جس سے مجھے ذاتی طور پر کوئی لطف نہ آئے وہ نہیں کروں گا۔

جہاز سے اترا تو کچھ واقفیت نہ تھی لہذا ایک ہوٹل میں انتظام کیا یہاں اپنے ایک رشتہ دار سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی اور سب سے پہلا سوال جو ڈرتے ہوئے میں نے کیا وہ یہ تھا۔

"کیا میری والدہ زندہ ہیں؟"

جواب سے بڑی تسلی ہوئی تو اب یہ خیال ستانے لگا کہ میری والدہ کی آنکھیں میرے راستے پر لگی ہوں گی اور واقعی ایسا ہی تھا۔ گھر جاتے ہوئے لاہور کے چند دوستوں

سے بڑی دلچسپ اور پیاری ملاقاتیں بھی نصیب ہوئیں مگر اب زندگی کا نیا دور تھا۔

نئی اننگیں ـــــ نیا زمانہ

میرے عزیز بھائی اسماعیل خان مجھے لاہور آکر ملے۔ ان سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ وہ میرے بھائی ہونے کے علاوہ میرے دوست اور گھر کے دوست کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ہم دونوں بھائیوں نے کبھی کوئی معاملہ ایک دوسرے سے راز میں نہیں رکھا۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ میری زندگی کے بنانے میں اس بھائی کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ میرے لئے یہ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے ان میں یہ خوبی ہے اور غالباً درجۂ اتم ہے کہ دوسرے بھی بھائیوں کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ میرے لئے تو ہر وہ تکلیف جو ایک انسان دوسرے کے لئے برداشت کر سکتا ہے، اس عزیز بھائی نے اٹھائی۔ ہم بہن بھائیوں میں زیادہ بردبار بھی یہی ہیں میری والدہ کو ان پر بے حد اعتماد تھا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو آپس میں آج تک بے حد الفت ہے۔

جب میں ولایت گیا تھا تو میرے گھر کے مالی حالات نہایت ہی تسلی بخش تھے اس وقت والد صاحب زندہ تھے۔ ہر کام میں خود دلچسپی لیتے تھے۔ جب میں واپس آیا تو ہمارے گھر کے حالات مالی طور پر نہایت ہی گر چکے تھے حقیقت یہ ہے کہ والد کی موت کے بعد اس عزیز بھائی کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا کاروبار سو قسم کے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کام بگڑتے گئے۔ کاروبار میں نقصان ہوا۔ اپنی ساکھ اتنی نہ رہی کئی لوگوں کے سوچنے کا یہ بھی طریقہ تھا کہ شاید والد کی اپنی قسمت تھی جو موت پر وہ ساتھ لے گئے۔ میں جب ولایت سے آیا تو

میں وہاں سے دس پونڈ ساتھ لے کر چلا تھا جو جہاز پر ختم ہو گئے تھے۔ کچھ پیسے البتہ وہاں سے بنک کے ذریعے لاہور بھجوا دیے تھے وہ لیے تو آرام سے گھر تک پہنچے۔

اپنی والدہ کو مل کر دلی اطمینان نصیب ہوا۔ والد کی قبر پر گیا دعا مانگی۔ سب بہن بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ گاؤں کے لوگ بھی آئے یہ سن کر حیران ہوئے کہ میں ابھی تک اپنی زبان بول سکتا ہوں۔ یعنی صاف پہاڑی۔ اپنی زبان بھلا کون بھلا سکتا ہے اور میں یہ وثوق سے کہتا ہوں کہ خواہ بیس سال باہر آدمی کیوں نہ گزارے ملک میں آنے کے بعد اپنی گفتگو فوراً زبان پر آجاتی ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ نہ آئے۔ البتہ کئی صاحب باہر سے آکر تننے لگتے ہیں اور اوٹ پٹانگ کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ محض دکھاوے کی باتیں ہیں۔

نام میں کیا رکھا ہے!

میری والدہ نے یا کسی اور عزیز نے یہ دریافت نہ کیا کہ کیا میں شادی کر کے آیا ہوں۔ کسی کو گمان ہی نہ تھا کہ میں چار سال ولایت پڑھ کر آیا ہوں اور سوائے میری اچھی صحت کے (جو زیادہ اس سمندری جہاز پر بنی تھی) میرے لب ولہجہ یا طرز گفتگو یا اٹھنے بیٹھنے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ میرے گھر والے اس پریشانی میں کہ وہ مجھے کس نام سے بلائیں۔ جب میں ولایت گیا تھا تو ایک گاؤں کا نوجوان بھی مجھے ابراہیم کہہ کر پکارتا تھا اور بی۔ اے کرنے کے بعد بھی ایسا ہی تھا۔

اب جبکہ میں ولایت میں سات سمندر پار سے پڑھ کر آیا ہوں تو میرا نام کچھ اور ہونا چاہیئے تھا چنانچہ سب بہن بھائیوں نے ایک شام جھجکتے ہوئے مجھ سے دریافت

کیا تو میں نے ہنس کر انہیں کہا کہ میرا وہی نام پکارو جو پہلے پکارا کرتے تھے اور میں نے انہیں پیار سے سمجھایا کہ تعلیم حاصل کرنے سے نام تبدیل نہیں ہوتے میرے سب بہن بھائی اس سے بہت خوش ہوئے۔

میں ۱۹۴۱ء کی ابتداء میں واپس پہنچ گیا تھا۔ میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ مجھے بڑی اچھی ملازمت مل جائے گی مگر مجھے معلوم تھا کہ ملازمت کے لئے بڑی دربدری کرنی پڑے گی۔ پونچھ چھوٹی سی ریاست تھی۔ اس کے سب جج کو ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ملتی تھی جس میں گزارا مشکل تھا۔ راجہ صاحب پونچھ بھی فوت ہو گئے تھے۔ اب مجھ سے ہمدردی کس کو تھی۔ بہرحال رسمی طور پر پونچھ شہر گیا اور اپنی خدمات پیش کر دیں کیونکہ حکومت کی جانب سے مجھے وظیفہ ملا ہوا تھا مگر ہندو افسروں کو یہ پریشانی ہوئی کہ یہ واپس آگیا ہے اور دورانِ جنگ وہاں ہی مر کیوں نہیں گیا۔ ملازمت انہوں نے مجھے کیا خاک دینی تھی۔ مجھے بھی یہی چاہئے تھا۔

سر گوپال سوامی آئنگر

میں فوراً جموں چلا گیا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اگر ملازمت کرنی ہو تو کشمیر ریاست میں اچھے امکانات ہیں۔ ریاست میں میری تعلیم کا کوئی مسلمان نہ تھا۔ یعنی جس کے پاس قانون کی لندن یونیورسٹی کی ایل ایل بی ڈگری اور بیرسٹری بھی ہو۔ جن مسلمان افسروں کو میں ملا۔ انہوں نے کہا کہ کوشش جاری رکھو تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اس وقت گوپال سوامی آئنگر ریاست کے وزیراعظم تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پریشانی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے۔ "تم کدھر سے آگئے ہو؟ میری حکومت نے تمہیں بھیجا ہی نہیں تھا۔ بہرحال دوسری ملاقات میں ان کی میری لڑائی ہو گئی اور انہوں نے مجھے کہا کہ "جب تک میں وزیراعظم کشمیر ہوں تمہیں ریاست میں ملازمت کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے"۔

میں نے انہیں سخت باتیں کہی تھیں۔ میں ابھی ابھی ایک عالمگیر جنگ کے پنجوں سے نکل کر آیا تھا۔ جوانی جوش مار رہی تھی۔ اس بوڑھے وزیر اعظم کو دیکھ کر اور اس کا ڈکٹیٹرانہ رویہ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ اس نے ایسے الفاظ کبھی نہ سنے ہوں گے وہ خوشامد کے سوا کچھ سننے کا عادی نہ تھا۔ اسی طرح ایک دوسرے وزیر صاحب سے میری غلطی تلخ کلامی ہوگئی۔ ایسی باتوں سے میرے خیالات ایک آزاد خیال انسان کی حیثیت سے تبدیل ہونے لگے۔ لاہور سے دہلی تک ایک سال کا چکر کاٹنے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ ہندوؤں کی دنیا میں کسی مسلمان کو عزت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ انسانی غیرت اس کی اجازت ہی نہیں دے سکتی کہ ایسے انسانوں کے زیر سایہ انسان اپنی زندگی بسر کر سکے جن کا ذہن متعصب ہو۔ غالباً ایسے واقعات ہزاروں مسلمان نوجوانوں کو پیش آئے تھے مگر یہ معاملہ میرے ذہن میں اچھی طرح آنے لگا کہ مسلمان من حیث القوم الگ آزادی کے خواہاں کیوں ہیں۔ ریاست کشمیر میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا پس منظر بھی تعصب تھا۔

میں نے ۱۹۴۱ء کے آخر میں سری نگر چھوڑ دیا۔ جب میں سری نگر آیا تو شکر ہے کہ حبیب وہاں ڈی۔ ایف۔ او کے عہدہ پر تعینات تھے۔ میرے ولایت جانے کے بعد حبیب علی گڑھ چلے گئے تھے۔ وہاں سے آکر ریاست کشمیر میں اے۔ سی۔ ایف کے لئے چنے گئے اور ڈیرہ دون سے فارسٹ افسر کا امتحان دے کر وہ کشمیر میں ڈی۔ ایف لگے تھے میں حبیب کے ساتھ ٹھہر گیا۔ حبیب کے ساتھ دو تین ماہ سری نگر میں رہا۔ پھر سارے کشمیر کے مشرقی علاقہ کی سیر بھی کی۔ جب سردیاں شروع ہوئیں تو لاہور چلا آیا۔ لاہور آکر شاہد کے پاس ٹھہر گیا یہاں بھی ملازمت کا خیال تھا۔ پریکٹس کا خیال نہیں تھا۔ شاہد نے میری بڑی مخلصانہ خدمت کی۔ شاہد کے پاس خود کوئی ملازمت نہ تھی۔ مگر اچھے دوست کی طرح اس

نے میری عزت بھی کی۔ پھر میں نے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں چھ ماہ کے لگ بھگ رہا۔ وہاں سے ہندوستانی ایئر فورس کے لئے ڈیرہ دون جاکر ٹیسٹ دیا۔ جس میں میرا انتخاب ہو گیا۔ جب دہلی واپس پہنچا تو گوپال سوامی اینگر کی جگہ راجہ سر مہاراج سنگھ وزیر اعظم کشمیر کے نامزد ہو چکے تھے۔ میں جاکر انہیں ملا تو وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے یہ سن کر حیران ہوئے کہ ریاست میں میرے لئے ملازمت نہیں ہے۔ انھوں نے مجھے فوراً واپس آنے کی تلقین کی۔ چنانچہ ایئر فورس والی بات میں نے ترک کر دی اور واپس جموں گیا۔ ایئر فورس میں جانے سے میری زندگی دوسری راہ اختیار کر لیتی اس کے آخر کار کیا نتائج نکلتے میں کہہ نہیں سکتا البتہ میری موجودہ زندگی سے بے حد مختلف ہوتی اس میں کوئی کلام نہیں۔

بطور سرکاری وکیل

جموں اور سری نگر میں ملازمت کی کوشش جاری تھی کہ راجہ مہاراج سنگھ نے استعفےٰ دے دیا۔ اب کے میں نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ سری نگر میں پریکٹس بھی شروع کر دینی چاہیئے۔ میں نے ایڈووکیٹ کا لائسنس لے لیا۔ اپنی پریکٹس شروع کی۔ اتنے میں کیلاش نرائن ہکسر عارضی وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ انھوں نے مجھے خود بلا بھیجا۔ غالباً کسی نے میرے متعلق ذکر کیا تھا۔ کشمیر ریاست کے حالات متذبذب تھے۔ اسنے مجھے بلاکر کہا کہ سرکاری وکیل کی آسامی ہے۔ اگر میرے لئے قابلِ قبول ہو تو میں ان کو بتاؤں۔ میں نے دوستوں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ مجھے یہ قبول کر لینی چاہیئے اور میری تعیناتی میر پور میں ہو گئی۔

میر پور پہنچ کر معلوم ہوا کہ نوکری کرنا آسان بات نہیں ہے۔ مقامی قانون

اور ضابطہ فوجداری کچھ اور ہی معاملات ہیں۔ میں سب کچھ سیکھنے کے لئے تیار تھا وہاں بھی ہندو افسر تھے۔ سیشن جج ہندو تھے۔ انہوں نے اور مقامی وکلا (جو سب ہندو تھے سوائے دو وکیلوں کے) جو نہ ہونے کے ہی برابر تھے میرے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا کہ یہ باہر والا یہاں آیا ہے۔ بہر حال دھیرے دھیرے میں نے سب سے مقابلہ کرنے کی بجائے دوستی اور نرمی کی راہ اختیار کی۔ جو پالیسی کے ہر معاملے میں زیادہ قابل قبول ہونی چاہیئے۔ جنگ کی راہ وہاں اختیار کئے بغیر نہ رہنا نہیں چاہیئے۔ جہاں اور کوئی چارۂ کار نہ ہو مگر جب جنگ کا راستہ (جو مشکل اور کٹھن راستہ ہوتا ہے) آپ نے اختیار کر لیا تو پوری جوانمردی اور تندہی سے کرنی چاہیئے۔ ورنہ کمزوری کا اظہار کرنا آپ کے لئے اور بڑے کاز کے مقصد کے لئے مہلک ثابت ہو جائے گا۔ مشکل کے وقت میں اور جنگ کے وقت میں قوم کے لیڈر ایسے ہونے ضروری ہیں جو دشمن کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیں۔ اپنی قوم کو یہی سبق دیں کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے ہر لحہ بہتر ہے۔ سارے وکیل میرے دوست بن گئے اور خوش ہو گئے کیونکہ میں نے ڈپلومیسی سے زیادہ کام لیا تھا۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہو گا کہ راجہ مہاراج سنگھ کے بعد پھر ریاست میں وزیر اعظم سر جنیکل نرسن سنگھ راؤ ہو کر آئے تھے۔ میں ان سے بھی ہیں ملا تھا وہ مجھے مل کر بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی بڑے سبز باغ دکھائے کیونکہ میری تعلیم کی ڈگری دیکھ کر وہ خوش ہوئے تھے۔ نرسنگھ راؤ بڑے شریف انسان تھے۔ مسلمانوں کی ریاست میں امداد کرنا چاہتے تھے۔ جلدی ہی انہوں نے بھی استعفےٰ دیدیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ ایسے سخت تعصب کا شکار ہو چکے تھے کہ کسی بھی لیسے وزیر اعظم کو وہ برداشت

نہیں کر سکتے تھے۔ جو مسلمانوں کے لئے ہمدردی کا اظہار بھی کرے۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست کشمیر میں طوفان بغاوت بڑھتا جا رہا تھا۔ آج یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ چھ ماہ کی مختصر سی میعاد کے اندر یہ وزیر اعظم بدل گئے تھے۔ جب میں ۱۹۴۸ء میں سلامتی کونسل میں گیا تو وہاں گوپال سوامی اینگر سے دور سے صاحب سلامت ہوئی۔ شیخ عبداللہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے بلکہ شیخ صاحب کو وہ ساتھ ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان سے کوئی پاکستانی وفد کا فرد مل نہ سکے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر تاثیر تھے جو سیکرٹری کی حیثیت سے گئے تھے وہ شیخ عبداللہ کے دوست تھے شیخ صاحب سے تو ملاقات نہ ہوئی مگر شیخ صاحب کے ایک سیکرٹری زتشی صاحب تھے۔ ان سے تاثیر صاحب کی ملاقات ہوئی تھی۔ گوپال سوامی اینگر مجھے وہاں دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں جب راولپنڈی میں شیخ عبداللہ صاحب تشریف لائے تو ان کی پبلک تقریر سے مجھے علم ہوا کہ چودھری محمد علی (جو اس وقت سیکرٹری جنرل تھے) سے ملاقات ہوئی تھی یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ان لوگوں نے مجھے اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ کشمیر پالیسی میں حکومت پاکستان کی سب سے بڑی بدبختی یہ رہی ہے کہ اہل کشمیر اور ان کے راہنماؤں کو کبھی اعتماد میں نہ لیا گیا۔ اگرچہ صحیح اور دل لگتی بات کا اظہار بھی مشکل ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس دور میں گورمانی صاحب وزیر امور کشمیر تھے اسی دور سے آج تک وزارت امور کشمیر کی پالیسی یہ رہی ہے کہ کشمیر کے راہنماؤں کو باہمی تنازعوں میں مصروف رکھا جائے اور غالباً یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ تحریک آزادی کشمیر میں پاکستان کی جانب سے کوئی تعمیری قدم نہ اٹھایا جا سکا۔ میرے لئے یہ خیال ہمیشہ تکلیف دہ رہا ہے اور رہے گا۔

دوسری بار جب میں ۱۹۵۰ء میں سلامتی کونسل گیا تو اس وقت سر بی این راؤ

ہندوستانی وفد کے قائد تھے ۔ وہ سلامتی کونسل کے لونج میں مجھے بڑے پرتپاک طریقہ سے ملے اور گھنے لگے کہ پہلی ملاقات بڑے مختلف حالات میں ہوئی تھی ۔ پھر میرے ساتھ انہوں نے خوشی سے اپنی تصویر اتروائی ۔ سلامتی کونسل میں یہ رسم بنی ہوئی ہے کہ مخالف فریقین کو یکجا کھڑا کر کے تصاویر اتروا تے ہیں ۔ سر بی این راؤ نے کوئی اعتراض نہ کیا ۔ حالانکہ یہ اس کے ملک کے مفاد کے خلاف بات تھی کیونکہ ہندوستان آزاد کشمیر کے کسی وفد کو بھی فریق کی حیثیت دینے کے لئے کسی صورت میں آج تک تیار نہیں ہوا ہے جس میں ہندوستان نے اپنا رویہ کبھی نہیں بدلا مگر پاکستان نے کئی بار اپنا رویہ تبدیل کیا ۔ جس سے کشمیر میں ہماری تحریک کو نقصان پہنچا ۔ ان باتوں کا اپنی جگہ مفصل ذکر کروں گا ۔

شادی اور رفیقہ حیات

۱۹۴۲ء کے ابتداء میں دہلی چھ ماہ رہ کر واپس آیا ۔ اس سے پہلے میں لاہور میں تھا ۔ ۱۹۴۲ء کے چھ ماہ میں نے سری نگر میں گزارے تھے جب میں ۱۹۴۲ء میں سرینگر میں تھا تو سری نگر کے اچھے متمول شخص نے مجھے اپنی بیٹی کے رشتہ کی پیش کش کی یہ پیش کش واضح الفاظ میں نہ تھی ۔ ابھی ابتداء ہی ہو رہی تھی کہ حبیب کو اس کا علم ہوا ۔ وہ لوگ حبیب کے دوست تھے اور ان کا تعارف حبیب ہی نے میرے ساتھ کروایا تھا ۔ ان کے یہاں میرا آنا جانا حبیب کی وجہ سے ہوا تھا ۔ جب انہوں نے یہ ذکر حبیب سے کیا تو حبیب کو اپنی جگہ پریشانی ہوئی ہوگی ۔ مجھے حبیب نے یہ بات نہیں بتائی بلکہ چپکے سے اس نے ایک خط میرے بھائی صاحب کو لکھ دیا کہ میری شادی کا بندوبست اگر اپنے ہی لوگوں میں ہو جائے تو بہتر ہوگا مجھے ابھی تک شادی کا کوئی خیال نہ تھا ۔ اسی دوران میں

میں لاہور چلا گیا۔ پھر ان لوگوں سے میرا تعلق نہ رہا۔ البتہ ۱۹۴۲ء میں پھر سرینگر جانے پر وہ لوگ مجھے ملے۔ کہ بعد میں کئی بار ملتے رہے۔ وہی بے تکلفی رہی مگر شادی کا پھر ذکر اس لئے نہ ہوتا تھا کہ میری شادی میرے گاؤں میں ہو چکی تھی۔

۱۹۴۲ء میں جب واپس گیا تو میری والدہ کو یہ خواہش ہوئی کہ میری شادی کر دی جائے۔ میں نے اپنی والدہ کو پیار سے سمجھایا کہ ابھی میری نوکری وغیرہ نہیں لگی تو لہٰذا شادی کے لئے ابھی بہت وقت ہے۔ والدہ نے ایک نہ سنی کہ سب کی یہی خواہش ہوئی تھی۔ ۱۹۴۲ء ۱۹۴۳ء کے دوران پھر لاہور اور دہلی میں مجھے ایسے کئی لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ لاہور میں بہت سے لوگوں نے شادی کی خود خواہش کی۔ ایک جگہ تو کافی دور تک معاملہ پہنچ بھی گیا مگر میرا دل نہ مانا۔ میں اس کے وجوہات یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ میرے پاس کوئی سوچے سمجھے وجوہات نہیں ہیں۔ جن پڑھی لکھی لڑکیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان سے شادی کے لئے میرا دل ملنے کو تیار نہ ہوا اور کسی بھی لڑکی نے مجھے اپنی جگہ یہ فیصلہ کرنے پر تیار نہ کیا کہ شادی کر لوں۔

اپنے گاؤں میں جا کر والدہ کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میں نے شادی کی بات مان لی تو میں نے کڑی شرط یہ رکھی کہ دو ہفتہ کے اندر ساری بات طے ہو جائے یعنی منگنی ہو کر شادی بھی ہو جائے۔ اس سے زائد میرے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ ویسے بھی لٹکتی ہوئی باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ ہمارے علاقے میں سب سے اچھے اور باعزت حاجی محمد قاسم خاں صاحب تھے۔ بلا کسی تکلف کے میری شادی ان کی سب سے بڑی بیٹی سے طے ہو گئی۔ پندرہ دن کے اندر شادی مکمل ہو گئی جس طرح حاجی صاحب نے ہمارے ساتھ سلوک کیا وہ قابلِ تعریف تھا۔ سارا علاقہ ان کی شرافت کا پہلے سے قائل تھا۔ شادی کے معاملات میں لوگ

تکلفات میں پڑجاتے ہیں۔ ان تکلفات سے مجھے نفرت تھی جس طرح میں نے کہا
انہوں نے مانا۔ یہ بات پالیسی کے لحاظ سے بھی موزوں رہتی ہے اگر آپ لے اپنی
بیٹی کا رشتہ دینا ہے تو پہلے فیصلہ کچھ سوچ کر کرنا چاہیئے۔ ایک بار جو آپ نے فیصلہ
کر لیا ہو تو پھر لڑکے والی کی ہر شرط بلا جھجک قبول کرنی چاہیئے۔ اس سے شادی کرکے
راستے آئندہ کے لئے صاف ہو جاتے ہیں۔ غلط فہمی کے بہت کم امکانات رہ جاتے
ہیں۔ جب نکاح ہوا تو میرے خسر صاحب نے تھوڑا سا مہر میری بیوی کا رکھا جو میں
نے خود بڑھایا اس سے وہ حیران ہو گئے۔ یہ حق مہر میں نے اپنی حیثیت کے
لئے بھی یہ ایک اچھی مثال قائم ہوئی کہ دولہا نے اپنی بیوی کا حق مہر خود بڑھایا۔ شادی
کی ابتدا ایسے اچھے ماحول میں ہو تو میاں بیوی کی زندگی کے راستے صاف ہو جاتے
ہیں۔ زندگی کی منزلیں دھیرے دھیرے لطف اندوز ثابت ہوتی ہیں۔ بچوں کی
زندگیوں پر ایک خوشگوار اور نیک اثر پڑتا ہے کم از کم میرے ساتھ اسی طرح ہوا۔
اپنی گاؤں میں شادی کرکے مجھے فائدہ بھی رہا ایک تو یہ کہ میری بیوی کی
اور میری قسمت جب ملی تو میری بلندی اور ترقی کا آغاز ہوا۔ میری قسمت اس
دن سے بدل گئی۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے لیکن
میں ہمیشہ سے محسوس کرتا ہوں کہ یہی ہوا۔ اگر میرے ساتھ بحث میں پڑ جائیں گے
تو میں آپ کی معقول بحث کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ لہذا یہی کہوں گا کہ میرا احساس
ہے ذرا دور رس نگاہ سے اگر نفسیاتی طور بھی سوچا جائے تو اچھا خیال ہے۔

میری بیوی نے میری تمام تر توقعات پوری کیں۔ میں نے اپنی بیوی کو پڑھانا
شروع کیا۔ اچھی خاصی تعلیم دی۔ میں اپنی بیوی کو متواتر پانچ سال پڑھاتا رہا۔ اس
دوران میں میری بیوی نے میری تمام عادات کا اندازہ لگا لیا۔ میرے بولنے کا
طریقہ۔ اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ۔ کس چیز سے مجھے نفرت ہے۔ کس چیز سے مجھے لگاؤ

ہے - یہ باتیں میری بیوی نے ایک خاص اہتمام کے ساتھ سیکھی ہیں - پوری توجہ کے ساتھ اور پورے اہتمام کے ساتھ میری بیوی آج دن تک تمام چیزوں کا خیال رکھتی ہے اور میری عادات و رجحانات کا احترام کرتی ہے ——— اس نے اپنی شخصیت کو مٹا کر میری شخصیت میں کلیتہً مدغم کر دیا - برابر کی بحث اور مباحثے کی گنجائش ہی نہیں رہی - اس لئے اختلافات والی کوئی بات ہی نہیں - جہاں کوئی بات تصفیہ طلب ہو میرا جو آخری فیصلہ ہوتا ہے اسی کو پھر گھر میں مانا جاتا ہے میں اپنے گھر میں خدانخواستہ ڈکٹیٹر نہیں ہوں - میں اپنا گھر کا سب کچھ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی بیوی کے حوالے کر کے جہاں چاہوں جا سکتا ہوں - سب معاملات کو میری بیوی اعتماد - اہتمام اور انتظام کے ساتھ سنبھال لیتی ہے اگر یہ خیال ہے کہ میں گھر میں ڈکٹیٹر ہوں تو اس میں زیادہ حرج کیا ہے - اب ہمارے باہمی تعلقات اس قسم کے ہیں کہ میری بیوی فرمائش کے طور پر کوئی کام مجھے کہے تو اس کے ٹھکرانے کا میرے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوگا - میرے اب چار بچے ہیں جن میں تین بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے - میں اپنے بچوں کو بہت پیار کرتا ہوں - بچوں کو ایک بہترین نعمت خیال کرتا ہوں - بسا اوقات اپنے بچوں کی محبت سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہوں کہ میری ساری کائنات سمٹ کر ان بچوں میں جمع ہو جاتی ہے - بہشت کا صحیح تصور آپ کے ذہن میں سما سکتا ہو تو جان لیں کہ میں بسا اوقات اپنے آپ کو بہشت میں پاتا ہوں زندگی کے بعض لمحات اس طرح پُر لطف ہوتے ہیں کہ انسانی زندگی بہشت کی زندگی سے کیا کم ہوگی -

گاؤں کی لڑکیاں

میری بیوی نے میری والدہ کو کبھی ناراض نہ کیا اور میری پیاری والدہ نے بھی میری بیوی کی ہمیشہ عزت کی۔ میری سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی کہ میری بیوی میری والدہ کو پسند ہو۔ میں آج سوچتا ہوں اگر میں ولایت سے شادی کر کے آتا تو میری والدہ کی کیا خدمت کر سکتی! غالباً یہ ایک بڑی غلطی ہوتی اور ولایت کی شادی کبھی بھی نہ نبھ سکتی۔ پڑھی لکھی گریجویٹ بھی میری بیوی ہوتی تو بھی پہاڑ میں جا کر کب وہ میری والدہ کی خدمت کر سکتی تھی اس طرح میری والدہ اپنی پیاری خواہش سے محروم ہو جاتیں جو خوشی میرے بچوں کو دیکھ کر میری والدہ کو ہوتی تھی اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ دنیا میں جو میری ترقی ہوئی جو بھی میری عزت ہوئی جو بھی میری کامیابی ہوئی۔ یہ سب محض میری والدہ کی نیک دعاؤں کی وجہ سے ہوا۔ اس میں میرا یقین ہے۔ یہ یقین کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا۔ یہ یقین بھی اچھا ہے کہ ذہنی طور پر یہ بات ایک گونہ میرے لئے حوصلہ افزا رہی ہے۔ ایسے یقین میں انسانی کمزوری کا کوئی برا پہلو نہیں ہے۔

پھر اگر غور کریں کہ ہم پہاڑوں کے نوجوان بڑی بڑی تعلیم حاصل کر کے بڑے عہدوں پر چلے جائیں اور باہر سے شادیاں کرلائیں تو ہمارے ملک کی غریب مگر مخلص اور سادہ لڑکیاں کہاں جائیں گی۔ کیا یہ بات ہمارے لوگوں کے لئے ایک سانحہ نہ بن جائے گی؟ ہمارے ملک کی لڑکیاں بے حد حسین ہوتی ہیں۔ ذہن بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں۔ اگر تعلیم کے زیور سے ان کو آراستہ کیا جائے تو حسن پر یہ زیور ان کو بے مثال بنا دیتا ہے۔ قدرت نے ایسا اچھا رنگ دیا ہوتا ہے جو محض جاہل ہونے کی وجہ سے بغیر قدر کروائے مٹ جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے جس چہرے پر جوانی میں سو حسن نچھاور ہوتے ہیں۔ اس ملک کی ایسی ہی غریب اور بے کس عورت نے

یہاں کے نوجوانوں کو جنم دیا ہے اور دیتی رہیں گی۔ اس کا خیال تک بھی مردوں کو نہیں آتا کہ جن عورتوں نے ہمیں جنم دیا ہے ان کی عزت۔ حرمت اور پرورش بھی ضروری ہے اور دنیا کی جس قوم نے اپنی عورتوں کی عزت نہ کی ہو وہ کب معراج ترقی پر پہنچ سکتی ہے؟

میرپور اور ازدواجی زندگی

میری ازدواجی زندگی کی ابتدا میرپور شہر میں ہوئی۔ سردیوں کے لئے میرپور شہر بہت ہی اچھا مقام ہے۔ یہاں کا پانی صحت کے لئے مفید ہے کہتے ہیں کہ علاقہ کا پانی اور گرمی صحت کے لئے بہت ہی اچھے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مجھے میرپور شہر سے الفت ہے میری زندگی کے اس دور کی خوبصورت ابتدا اسی شہر میں ہوئی۔ میری زندگی کے بہترین ایام اسی شہر سے وابستہ ہیں جب بھی میں اس شہر میں داخل ہوتا ہوں مجھے فخر محسوس ہوتا ہے۔ عموماً میرپور علاقہ کے لوگ مجھے پسند ہیں اور دوسروں کی عزت کرنے میں خوش ہوتے۔ آپ کو بھی ان کی عزت کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔

میں ان مسلمان افسروں میں تھا جنہوں نے پہلی دفعہ اس شہر میں مسلمانوں کو "السلام" کہی۔ اس بات سے یہ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ کوئی مسلمان جو ڈوگرہ حکومت کا ملازم ہو وہ "السلام علیکم" نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ یہاں ہندو مسلمانوں سب کو سلام کہتا تھا وہ بھی ہاتھ جوڑ کر۔ یہ کوئی قانونی پابندی کی صورت نہیں نہ تھا مگر ضروری تھا ایسا نہ کرنا ہندو افسر معیوب خیال کرتے تھے۔ اور ان کے تحت آپ کو رہ کر ملازمت کرنا ہوتی تھی۔ یہاں کے ہندو بڑے صاحب و وسعت اور صاحب رسوخ لوگ تھے۔ وکالت بھی کرتے تھے پھر اسی پیشے سے ساہوکاری بھی کرتے

تھے۔ ملازم بھی ہندو تھے۔ تنخواہ کے علاوہ کھلی رشوت لیتے تھے۔ پھر اس سے ساہوکاری
کرتے تھے۔ شہر میرپور میں ہندو بنیوں کی اکثریت تھی۔ ان کا غلبہ اس قدر تھا کہ مسلمان
وہاں بالکل دبے ہوئے تھے۔ سارے مسلمانوں کی زمینیں گرد ہو چکی تھیں۔ مسلمان
عورتیں مجبوراً ان ہندوؤں کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔ ان ہندوؤں نے
مسلمانوں کی خودداری کو پامال کر رکھا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب انقلاب آیا تو ہندوؤں
نے سونے کی اینٹیں اٹھا اٹھا کر کنوئیں بھر دیے۔ صدیوں کے مظالم کا بدلہ مسلمانوں
نے بھی ایک ہی بار لیا۔ مانا کہ بڑے اچھے اور معصوم لوگ بھی مارے گئے مگر
انقلاب جب طوفان کی طرح آتا ہے تو سب خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے
ہیں پھر انقلاب اچھے بُرے کی تمیز کس طرح اور کب کرتا ہے!

فرانس کے انقلاب میں کیا کچھ ہُوا؟ روس کے انقلاب میں کیا کچھ ہُوا؟
جب ان انقلابات کی تفاصیل تاریخ میں پڑھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ تو کلیجہ منہ
کو آتا ہے جموں کے مسلمانوں کے ساتھ بھی اسی قسم کے انقلاب ہوئے۔ جموں
میں ایک تخمینہ کے مطابق دو لاکھ مسلمان شہید کئے گئے جن میں معصوم بچے بھی شامل
تھے۔ وہاں تو مسلمان پہلے ہی مظلوم اور مجبور تھے ان پر ڈوگرہ شاہی کا طوفان آیا
پھر ہندوستان میں نہتے مسلمانوں پر جو کچھ گزری وہ کس قدر دردناک داستان ہے۔
ان حالات کی گھناؤنی تفصیل صرف آئندہ کا تاریخ دان ہی صحیح طریقے سے ریکارڈ کر سکتا
ہے۔ سارے ہندوستان کے مسلمان ایک عظیم انقلاب سے گزرے ہیں۔

جموں ــــ شہر نگاراں

جب میں میرپور سے جموں کے لئے روانہ ہوا تو مجھے میرپور کے ہندو وکیلوں
نے مخلصانہ طور پر رخصت کیا۔ میری تبدیلی ۲ سال کے بعد جموں ہو گئی۔ میری ترقی

کی منزلیں میری توقع سے بھی جلدی طے ہونے لگیں اس شہر میں میں ایک سال رہا۔ وہاں ہی میرا پہلا بچہ جاوید پیدا ہوا۔ جموں میں مکانوں کی بے حد قلت تھی۔ چھوٹا سا مکان ملا۔ اس شہر کے لوگوں نے جو نیکیاں میرے اور میری بیوی کے ساتھ کیں وہ ہم لوگ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں نے میری بیوی کی بڑی ہمدردانہ خدمات بچے کی پیدائش کے دوران سرانجام دیں جو بیٹیاں کوئی خدمت کر سکتی تھیں وہ نوافل ادا کر رہی تھیں۔ میں نیچے جا کر مقدمے تیار کر کے سو گیا۔ صبح مجھے کسی نے جگا کر کہا کہ میں ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ بیٹے کا باپ بننا کوئی بڑے فخر کی بات ہے ورنہ اس معاملے پر اس سے پہلے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ یہ بات سوچنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی تھی کہ ایک بیٹے کا باپ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ مجھے ایک نیا سا فخر محسوس ہوا۔ جن دوستوں نے میری اس دور میں مخلصانہ خدمات کیں ان میں سے بہت سے جموں کے حملوں میں کام آئے۔ ان دوستوں کی یاد اور ان کے بچے جس طرح شہید ہوئے ان کے واقعات میرے دل سے آسانی سے محو نہیں ہو سکتے۔ جموں اچھا شہر ہے پہاڑی پر واقع ہونے سے پانی نالیوں سے فوراً بہہ جاتا ہے اس لئے صاف اور ستھرا ہے۔ شہر جموں کی آبادی لاکھ کے قریب ہو گی جس میں مسلمان صرف تیرہ چودہ ہزار تھے۔ یہ اقلیت ہمیشہ ان ہندوؤں پر غالب اور حاوی رہتی تھی۔ ہندو ان مسلمانوں سے سہمے رہتے تھے۔ یہ مسلمان بے ڈر اور بے باک تھے۔ مجھے ان نوجوانوں کی بڑی قدر ہے جو عید میلاد النبیؐ کے جلوس میں ہندوؤں کے بازاروں سے چھاتیاں تان کر گزرتے تھے۔ فساد میں ان کے گھروں کی اوپر کی چھت پر پانی کی نال پکڑ کر چڑھ جاتے تو ہندو اپنے مکان چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ یہ میں نے خود دیکھا ہے۔ ایسے

واقعات سے دل کو تسلی ہوتی تھی۔ میرا جاوید مٹا اسی شہر کی پیدائش ہے۔ اس وجہ سے بھی اس شہر سے ایک گونہ الفت ہوگئی تھی۔

میں جموں شہر میں ایک سال رہا ہوں گا کہ میں ترقی پاکر اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل بن گیا۔ یہ ترقی پہلی سے بھی جلدی ہوگئی۔ پھر مجھے ہائیکورٹ کے ساتھ ساتھ سری نگر اور جموں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ جموں کے وکلاء سے میرے بہترین تعلقات تھے۔ سب میری شخصیت کے قائل ہوگئے اور میری عزت کرنے لگے۔ سب سے میں نے بھائیوں کے سے تعلقات رکھے تھے۔ جموں کے ہندو وکیل اپنے کام میں بڑے ہوشیار تھے۔ بڑی محنت سے کام لیتے تھے۔ تھوڑی تعداد مسلمان وکیلوں کی بھی تھی چند بے چارے وہیں شہید ہوگئے تھے جبکہ باقی پاکستان میں آگئے ہوئے ہیں۔

اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل کے بعد مجھے ایڈوکیٹ جنرل ہوجانا تھا پھر میرے لئے ہائیکورٹ کا جج ہوجانا چند سال بعد ممکن ہی نہیں ہوگیا تھا بلکہ سامنے نظر آرہا تھا۔ ہندوستان میں حالات بدل رہے تھے ان سے بھی لاتعلق نہ تھا۔ کچھ حکومت کے ہندو افسروں کے تعصب کی وجہ سے ان سے نفرت میرے دل میں بڑھتی جاتی تھی۔ ان کے زہریلے تعصبات پریشان کن تھے۔ بعض اوقات ایسی باتیں بھی کرنی پڑتی تھیں۔ جو ضمیر کش ہوتی تھیں۔ ہندو مسلم فسادات کے مقدمات جب مجھے سرکار کی جانب سے کرنے پڑتے تھے تو مجھے اپنا ضمیر سخت کوستا تھا۔ مجھ سے معاملہ برداشت ہی نہ ہوسکتا تھا۔ پھر بھی ملازم ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا پڑتا تھا اور ہندوؤں کی خوشامد کئے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا تھا چکہ جج ہندو بڑے افسر ہندو لہذا ان کی روزانہ خوشامد کس طرح کوئی کرے۔ ان کی کوٹھیوں کے چکر کاٹنا میرے لئے موت

تھی۔ کوئی چیز مجھے سخت پریشان کرتی تھی تو وہ کوٹھیوں پر جا کر لوگوں کو سلام کرنے والی بات تھی بالآخر ملازمت چھوڑنے پر آمادہ کرنے والی یہ بھی بات تھی کہ اب سلام کرنے کسی کو نہیں جاؤں گا۔ اپنے ایک مسلمان جج ہائیکورٹ بھی میرے مخالف اسی لئے ہو گئے کہ انہیں اپنی نوکری خطرہ میں نظر آنے لگی۔ وہ پلٹ کے رہنے والے نہ تھے انہیں یہ وہم سوار ہو گیا کہ میں جلد ہی ترقی کر کے ان کی جگہ لے لوں گا۔

بالآخر جب استعفیٰ دیا تو منظور کرنے سے ہندو پرائم منسٹر گھرائے۔ استعفےٰ منظور کروانے کے لئے سفارشیں کروانی پڑیں۔ ہندو لوگ حیران ہوئے کہ آخر یہ شخص پاگل کیوں ہو گیا۔ جب آپ کسی چیز کو حاصل کرنا چاہیں اور بے نیاز ہو جائیں تو قدرت کی جانب سے اور کئی دروازے بغیر کوشش کے کھل جاتے ہیں۔ جرأت کرنے اور فیصلہ کن طبیعت رکھنے کی ضرورت ہے ہر فیصلہ کرنے میں حوصلہ مندی کی ضرورت ہے۔ جس شخص نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہ کیا اس کی کشتی اس کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔ جن دنوں میں نے استعفےٰ دیا، مسلم کانفرنس کے سلسلے لیڈر ایک غیر ضروری تحریک میں قید ہو چکے تھے۔ میں نے سیاسی کام پورے انہماک اخلاص اور جرأت سے شروع کیا اور ہر خطرہ مول لینا میں نے زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔

خارزارِ سیاست میں

استعفےٰ دینے کے بعد میں فوراً سیاست میں کود پڑا۔ اس وقت مسلم کانفرنس عجیب حالات سے دوچار تھی۔ چودھری حمید اللہ مرحوم اور میر واعظ یوسف شاہ آپس میں سخت اختلاف رکھتے تھے اور ان کا اتحاد ناممکن ہو چکا تھا۔

میں نے اور دوسرے دوستوں نے مل کر بڑی کوشش کی مگر رائیگاں گئی۔ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں میری دانست میں اس سے نازک وقت غالباً کوئی نہ تھا۔ ہندوستان میں حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کا معاملہ سامنے نظر آرہا تھا۔ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس وادی کشمیر میں بڑی مضبوط تھی۔ ان لوگوں نے وادی میں کارکنوں کا جال بچھا رکھا تھا اور عوام تک پہنچ کر انہوں نے عوام کو اپنے گرد جمع کیا ہوا تھا۔ عوام کے کام بھی وہ لوگ سرانجام دیتے تھے مگر مسلم کانفرنس کے پاس وادی میں کارکن ہی نہ تھے جو تھے وہ آپس میں بٹ چکے تھے۔ پھر نیشنل کانفرنس والے مسلم کانفرنس کے کارکنوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ مسلم کانفرنس کے کارکن اس قدر مرعوب اور دب چکے تھے کہ سامنے اگر جلسے کرنا بھی ان کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔

میں نے استعفیٰ ۱۹۴۶ء کو ستمبر اکتوبر میں دیا۔ انہی دنوں میں اسمبلی کے انتخاب بھی ہونے والے تھے۔ مسلم کانفرنس نے مجھے اپنے حلقہ انتخاب سدھنوتی باغ کا ٹکٹ دے دیا۔ میں فوراً اپنا استعفیٰ منظور کروا کر اپنے حلقہ انتخاب میں چلا گیا۔ میرے پاس الیکشن لڑنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ راولاکوٹ سے جا کر ایک دوست کو ٹیلیگرام دیا۔ اس نے مجھے دو ہزار روپے قرضہ حسنہ دیا۔ جو میں نے بعد میں انہیں واپس کر دیے۔ رام چند رکاک وزیراعظم تھے۔ اس ہندو وزیراعظم سے زیادہ متعصب اور کوئی نہ ہوا ہو گا۔ اس نے جنوری کے پہلے ہفتہ میں انتخاب رکھے۔ اس مہینہ میں ساری ریاست کشمیر میں طوفانی برف پڑتی ہے۔ اگر کوئی موسم انتخاب کے لئے ناموزوں ہو سکتا ہے تو ریاست کشمیر میں یہی ہو سکتا ہے۔ وزیراعظم کاک نے اپنی ایک الگ پارٹی

بنالی ۔ اس کا نام غالباً عوام کی پارٹی رکھا تھا ۔ ریاست میں اس وزیر اعظم نے دھاندلی مچانے کا پروگرام بنایا ۔ یہ سنگدل جابر اور ظالم انسان ـــــــ مغرور اور ہٹ دھرم بھی اسی قدر تھا مگر ۱۹۴۷ء کے بعد اسے بھی شیخ عبداللہ کے ہاتھوں بہت ذلیل ہونا پڑا ۔ شکر ہے کہ اسے دنیا میں ہی سبق ملا ۔ اس کا دوسرا بھائی امرناتھ کاک جو وکالت کرتا تھا نہایت ہی دانا اور روشن ضمیر آدمی تھا ۔

جب میں اپنے حلقۂ انتخاب کی جانب روانہ ہوا تو کچھ علم نہیں تھا کہ کیا حشر ہوگا ۔ سارا نظامِ حکومت میرے خلاف تھا ۔ وزیر پونچھ الگ ایک متعصب اور سازشی آدمی تھا ۔ اس کا سارا مقصد یہی تھا کہ حکومت کے پٹھو میرے خلاف کھڑے کئے جائیں اور انہیں ہر صورت کامیاب کیا جائے ۔ پہلے تو اس نے یہ پروگرام بنایا کہ میرے کاغذات نامزدگی ہی مسترد کر دیے جائیں تاکہ جھگڑا ہی ختم ہو ۔ سردار نسیم خاں (جو آج کل آزاد فوج میں کپتان ہیں اور سردار یاسین خان جو آج کل پریکٹس کرتے ہیں ۔ میرے خلاف کھڑے ہوئے سردار نسیم خان کو وزیر پونچھ کی مکمل حمایت حاصل تھی ۔ سردار یاسین خان آزاد امیدوار تھے ۔ مگر دونوں میرے ہی خلاف کھڑے ہوئے تھے ۔ البتہ سردار نسیم خان اور سردار یاسین خان کی اپنی جگہ بھی ٹکر تھی کیونکہ یہ دونوں نزدیک کے رہنے والے ہیں ۔

سردار نسیم خان کو وزیر بھیم سین (جو وزیر پونچھ تھے) نے یقین دلایا تھا کہ سردار ابراہیم کے کاغذات نامزدگی ہی مسترد ہو جائیں گے ۔ سردار یاسین کو وزیر پونچھ نے بلا کر کہا کہ انتخاب سے دستبردار ہو جاؤ مگر وہ نہ مانے ۔ چونکہ وزیر بھیم سین یہ چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس کو شکست ہو ۔ اور مسلم کانفرنس کا ٹکٹ صرف میرے پاس تھا ۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وادی کشمیر میں پہلے بہت سے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے گئے ۔ نیشنل کانفرنس نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا ۔ وزیر اعظم رام چندر کاک کو یہ خدشہ ہوا کہ سب ہی سیاسی جماعتیں اگر بائیکاٹ کر گئیں تو معاملہ بہت ہی ٹیڑھا ہو جائے

گا اور اسمبلی کا انتخاب محض ڈھونگ ہو جائے گا۔ ان حالات کے تحت وزیر پونچھ کو ہدایات آئیں کہ کسی بھی وجہ پر کاغذات مسترد نہیں ہونے چاہئیں۔ اس طرح سے بیسے لوگوں کی امداد ہو گئی۔

میں ابھی اپنے حلقہ انتخاب میں ہی تقریریں کر رہا تھا کہ ایک شام کو سردار محمد اقبال صاحب (جو اب ہائی کورٹ لاہور کے جج ہیں) کا تار آگیا کہ پونچھ شہر میں آؤ وہ میرے بڑے ہمدردوں میں سے تھے۔ میں رات بھر سفر کر کے چند دوستوں سمیت وہاں پہنچا مگر معاملہ طے ہو چکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نامزدگی کے کاغذات میں کچھ نقص نہ رہ گیا ہو مگر یہ محض وزیر جیم کی شاطرانہ چالیں تھیں۔ اگر نقص ہوتا بھی تو وزیر پونچھ مجھے کاغذات درستی کے لئے تھوڑے ہی دینے والے تھے مگر ہمدردی کرنے والے بڑے چوکس تھے۔

میں نے سارے علاقہ میں حتی الوسع دورہ کیا۔ کچھ علاقہ جس کے متعلق مجھے یقین تھا وہاں نہ جا سکا کیونکہ میرے لئے میدان اچھی طرح ہموار ہو چکا تھا۔ افسران کی بدمعاشیوں سے ابھی میں محفوظ نہ تھا۔ ۲ر جنوری کو جس دن ووٹ پڑنے کا دن تھا طوفانی برف اور بارش ہوئی۔ انسانوں کا گھروں سے باہر قدم رکھنا ایک جہاد کا کام تھا مگر سارا علاقہ آیا۔ مختلف پولنگ سٹیشنوں پر لوگوں نے آ کر ووٹ ڈالے۔ جس تکلیف سے یہ لوگ ووٹ ڈالنے آئے اس کا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ چار بوڑھے واپس جاتے ہوئے سردی کی شدت سے فوت ہو گئے۔ علاقہ بلندری (جو تحصیل سدھنوتی کا ایک حصہ ہے) کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک عورت نے اپنے خاوند کو زبردستی ووٹ ڈالنے بھیجا۔ جب مرد نے لیت و لعل کی تو عورت نے اسے کہا کہ تمہاری بیوی نہیں بنوں گی اور تم کو روٹی اپنے ہاتھ سے پکا کر نہیں دوں گی۔ اگر جا کر ووٹ ڈال کر نہیں آؤ گے اور ووٹ کے ڈالنے کے دو گواہ ساتھ نہ لاؤ گے۔ اس جذبہ کے ساتھ میرے لئے لوگوں نے ووٹ ڈالے تھے۔

جب ووٹ پڑ چکے تو ووٹوں کے بکس سرکاری افسروں کے ہی حوالے ہوتے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ ووٹ میرے بکسوں سے نکال کر دوسرے میں ڈال دیئے جائیں گے۔ اس لئے میں نے اپنی مہریں بنوا کر بکسوں کے تالوں پر لگا دیں۔ مگر یہ دو جگہ ہی ایسے ہو سکا۔ تین جگہ ایسا افسروں نے نہ کرنے دیا۔ بعد میں سردار غلام نبی خاں (جو آج کل آزاد کشمیر حکومت کی سروس میں افسر مال ہیں) نے مجھے بتایا کہ وزیر پونچھ نے بکس کھولنے چاہے تھے، اور مہریں بھی توڑنی چاہی تھیں مگر میرے دو بکسوں پر جو مہریں لگی ہوئی تھیں ان کے حروف پڑھے نہیں جاتے تھے۔ ورنہ مہریں توڑ کر ووٹ نکال کر دوسری مہریں لگانے کا انتظام تھا۔ اس طرح سے خدا نے اس مرحلے سے بھی بچا لیا جب ہمارے ووٹ گنے گئے تو میرے دونوں مخالفین کی ضمانتیں ضبط ہو گئی تھیں اور میں نے جموں مسلم کانفرنس کے مرکزی دفتر کو تار دے دیا۔

پھر میں نے جموں جا کر اپنی پریکٹس کی ابتدا کر دی۔ اپنی بیوی اور بچے جاوید کو ساتھ لے گیا۔ میرا خیال ہے کہ اپنی والدہ کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ جب جموں میں میں نے پریکٹس شروع کی تو یہ وہم تھا کہ گزارہ مشکل سے چلے گا۔ جموں ضلع ہندوؤں کا علاقہ ہے مسلمان اگر تھے بھی تو تعداد میں تھوڑے ہونے کے علاوہ اقتصادی طور پر بے حد پسماندہ تھے۔ وسط جنوری میں جموں پہنچا۔ ۳۰ جنوری تک میرے پاس دو ہزار روپے ہو گئے تھے۔ میں آج تک حیران ہوں کہ یہ کس طرح ہوا تھا۔ میرے پاس زیادہ تر ہندو مؤکل آئے تھے۔ اس کی صحیح وجوہات میرے ذہن میں کبھی نہ آ سکیں۔ اگر میں کچھ وجوہات ذہن میں لانے کی کوشش بھی کروں تو اغلباً وہ زیادہ فرضی ہوں گے۔ بعض اوقات مقدمہ لڑنے والے لوگوں کے ذہن میں یہ رہتا ہے کہ وہ ہندو وکیل آپس میں مل جاتے ہیں اور سرکاری وکیل کی حیثیت سے یہ لوگ میرا کام دیکھ چکے تھے مگر سرکاری ایڈووکیٹ کی حیثیت سے میری اتنی

کمائی کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔

ہندوؤں کی تیاریاں

مارچ اپریل تک جموں میں ہم سب رہے یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ جموں کے نواحی علاقوں میں میں نے دیکھا کہ ہندو لوگ سخت تیاریوں میں مصروف ہیں۔ مجھے اچھی طرح علم ہو گیا کہ ملک میں بڑے پیمانے پر قتل عام کرنے کے وہ منصوبے تیار کر رہے ہیں۔ میں نے جموں شہر کے مسلمان نوجوانوں کو بلا کر ساری بات سے آگاہ کیا۔ تیاری کے لیے سخت تلقین کی۔ مسلمان نوجوانوں نے اپنی قسم کی تیاری کرنی شروع کر دی۔ جموں شہر کے نوجوانوں کی میرے دل میں قدر ہے۔ اس نازک دور میں ان لوگوں نے میری زیرِ نگرانی جرأت مندی سے حفاظتی تیاریاں شروع کیں اور ہندو حکومت اور ہندو متعصب لیڈروں کی عین نظروں کے سامنے ایسا کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

مارچ اپریل میں ہماری اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ یہ بجٹ کا اجلاس تھا۔ بجٹ پر میری پہلی تقریر اچھی ثابت ہوئی اور سب کو پسند آئی۔ وزیرِ اعظم رامچندر کاک نے بھی پسند کی۔ زیادہ تنقید اس کی حکومت پر تھی۔ مجھے میرے دوستوں نے سمجھایا تھا کہ تنقید نہایت ہی سلجھی ہوئی اور تعمیری ہونی چاہیئے۔ تنقید میں ذاتی حملے نہیں تھے۔ گولیاں نہیں تھیں بلکہ انگریزی میں چچے تلے فقرے تھے۔ جن سے انگریزی جاننے والے سارے لوگ متاثر ہوئے۔ سب نے اٹھ کر مجھے مبارکباد دی۔ اس وقت میری عمر ۳۲ برس کے لگ بھگ تھی۔ مسلمانوں کے پست حوصلے بڑے بلند ہوئے اور پھر بعد میں تو ہم سب نے بڑی بے باکانہ تقاریر کیں۔ چودھری حمید اللہ مرحوم جو ہمارے اسمبلی میں لیڈر تھے بڑی بیباک

تقریر کرتے تھے۔ صرف ذاتی حملوں پر اتر تے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا ڈر انہیں نہیں ہوتا تھا۔ میری بڑی عزت کرتے تھے مگر میرا تجربہ اسمبلی کے کام کا جمعہ جمعہ آٹھ یوم کا تھا اور ان کا تجربہ دس سال کا تھا۔ پہلی دفعہ اپنی ساری تقریر انگریزی اخباروں میں چھپی ہوئی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور حوصلہ بڑھتا گیا۔

اسمبلی میں لیڈر شپ کا مسئلہ

مسلم کانفرنس اسمبلی گروپ میں لیڈر شپ کا سوال پیدا ہوا تو مسلم کانفرنس کے کئی ممبر چوہدری حمید اللہ مرحوم پر رضامند نہیں ہوتے تھے مگر میرے لئے رضامند تھے میں نے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ کوئی میری بے غرضی نہ تھی بلکہ میں نے انکار اس لئے کیا کہ مجھے تجربہ ہی نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کام نبھا نہیں سکتا۔ اسے اپنے ذمے لینا بڑی غلطی ہے۔ پھر چوہدری حمید اللہ مرحوم کے ناراض ہوتے میں گروپ بندی کو سخت نقصان کا خدشہ تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مقصد مسلم کانفرنس کو بحال رکھنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں کیا کیا مصیبتیں اٹھانا پڑیں ان کی تفصیل بیان یہاں ممکن نہیں ہے۔ مسلم کانفرنس اپنے صدر مقام جموں شہر میں عجیب دور سے گزر رہی تھی جہاں کوئی دفتر تھا اور نہ ہی کوئی بیٹھنے کی جگہ۔ مسلم کانفرنس کے لیڈر اپنے اپنے گھروں میں لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے مقابلے میں سری نگر میں نیشنل کانفرنس کا کام اور پارٹی کا نظام بڑا اچھا چل رہا تھا۔ اس کے پاس دفتر تھا۔ پریس تھا اور تربیت یافتہ کارکن تھے۔ ایک حکومت کے محکمہ کی طرح معاملہ چل رہا تھا۔ ان کے ہاں کھلے فنڈز تھے جو کانگرس ان کو اعلانیہ طور پر دیتی تھی۔ مگر مسلم کانفرنس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی! یہ بڑی دردناک کہانی تھی جس سے ہم سب کو ایک نازک ترین دور میں دوچار ہونا پڑا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے چوکنے ہو کر اپنی فوجوں کی تربیت شروع کر دی اور سارے سرحدی علاقہ میں اپنی فوجیں بچھا دیں۔ خصوصاً پونچھ کے تو ایک ایک مرکز میں فوجی چوکیاں قائم کی گئیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو صحیح طور پر جتایا گیا تھا کہ علاقہ پونچھ فوجی علاقہ اور ابھی ابھی جنگ عظیم سے ہزاروں سپاہی جنگ کے محاذوں سے واپس آئے ہیں ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ اس علاقہ کا تعلق بلاواسطہ طور پر پاکستان کے علاقہ سے ہے۔ اس لئے دریائے جہلم کی ناکہ بندی کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے سارے علاقے کا دورہ کر کے فوجیوں کو ہدایات دی تھیں جو براہ راست محکمہ کے افسروں کو بھی نہ دی تھیں کیونکہ ان پر اسے اعتماد نہیں تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے فوج کے اعلیٰ افسروں کو یہ حکم دیا تھا کہ وقت آنے پر ریاست کی مکمل حفاظت کی جائے اگر یہ نہ ہو سکا تو ناکہ بندی کر کے مسلمانوں کا عام قتلِ عام کر دیا جائے۔ پونچھ کے لئے خصوصاً یہی احکام تھے۔

جہاں اپنی طرف سے یہ ہوشیاری ہری سنگھ صاحب نے کی۔ وہاں انہوں نے مہلک غلطی اپنے لئے یہ کی کہ تھوڑی سی فوج کو جموں کشمیر کے مختلف علاقوں میں بکھیر دیا کچھ لداخ کی طرف اور گلگت بھیج دی گئی کچھ پونچھ میں رکھی گئی اور جموں شہر میں دو سو کے لگ بھگ سپاہی رہ گئے۔ یہی حالت سری نگر شہر کی تھی مگر افسوس کہ اس غلطی کا فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ خیر میں اس کا ذکر بھی اپنی جگہ کروں گا۔

ڈوگرہ فوج

اسمبلی کے اختتام پر میں نے جموں شہر سے اپنا بوریا بستر باندھا اور علاقہ پونچھ کا رُخ کیا۔ مجھے بہر صورت گرمیوں میں سری نگر چلے جانا تھا۔ ہائیکورٹ

گرمیوں میں سری نگر جاتا ہے۔ اس لئے میں ہائی کورٹ کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا ایک ماہ کے لگ بھگ وقفہ مل جاتا ہے۔ جب میں پونچھ پہنچا تو ڈوگرہ فوج جگہ بجگہ بکھیر دی گئی تھی اور ان کی چوکیاں تمام اہم مقامات پر بٹھا دی گئی تھیں۔ مجھے یہ حالات دیکھ کر بڑی پریشانی ہوئی۔ بہار کا موسم ٹھاٹھیں مارتا ہوا پونچھ کے علاقہ پر خوشیاں بکھیر رہا تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو ایک دوسری دنیا میں لے جاتی تھی۔ خصوصاً ہمارے یہاں جنگلی گلاب کا پھول ہوتا ہے۔ جس کی خوشبو میلوں تک پھیل جاتی ہے ان پھولوں پر شہد کی مکھیاں اور دوسرے بھنورے چکر کاٹتے ہوئے ایک قسم کی پیاری اور دل کش موسیقی پیدا کرتے ہیں۔ چڑھتے ہوئے سورج کے وقت یہ سماں بہت ہی بھلا لگتا ہے۔ ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ ہی سارا علاقہ ایک دل کش رنگ سے رنگین ہو جاتا ہے اور ہر دل کو رومان کی طرف اکساتا ہے۔ ایسا موسم میں نے اٹلی۔ فرانس۔ بلجیم یا سوئٹزرلینڈ میں بھی نہیں دیکھا۔ یہ علاقہ یقینی طور پر اپنی خوب صورتی اور قدرتی مناظر کا ثانی نہیں رکھتا۔

اس علاقے میں ڈوگروں نے سختیاں شروع کر دیں اور ہر طرح فرعون مزاجی سے پیش آنے لگے۔ جہاں گاؤں والے پانی بھرتے تھے اور جہاں گاؤں کی معصوم بچیاں پانی بھرنے روزانہ جایا کرتی تھیں۔ اب وہاں ڈوگروں کے سپاہی ننگے نہانے لگے۔ ان بچیوں کو گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔! اس بے غیرتی اور بے عزتی کے ماحول میں غیرت مند انسانوں کے لئے اس سے زیادہ مشتعل کرنے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ انسان کا خون کھولنے لگتا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں چھوٹے اہلکاروں کے غلط کردار اور فرعون مزاجی سے تہ و بالا ہوتی ہوں گی! ایک جگہ پانی پر جھگڑا ہوا تو لوگوں نے ایک فوجی افسر کو سخت مارا اور ساری کمپنی عوام پر بندوقیں لے کر چڑھ آئی

مگر کسی طرح بچ بچاؤ ہوگیا۔ ساری آبادی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو رہی تھی۔ ڈوگرہ حکومت نے مسلمانوں کے لیڈروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ بلاوجہ لیڈروں کو باندھ کر لے جاتے تھے پھر ان کی واپسی کی کوئی امید ہی نہ رہتی تھی۔ سیاسی طور پر یہ علاقہ پوری طرح منظم تھا۔ اس علاقے میں ہزاروں کی تعداد میں سیاسی کارکن موجود تھے۔ جن کے تجربے سیاست میں صرف کشمیر ریاست کی چاردیواری تک محدود نہ تھے۔ بلکہ یہ کارکن سارے ہندوستان میں مسلم لیگ کے لئے کام کرچکے ہوئے تھے لہذا ایسے لوگوں کو قابو میں رکھنا میرے یا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

میں نے حکومت کو متنبہ کیا۔ اور حالات سے آگاہ کیا، جلسوں کے ذریعے بھی اور خطوط اور تاریں بھیج کر بھی۔ اپنی جگہ میں نے پوری تیاری مقابلے کی شروع کر دی۔ رات کے وقت ہم نے اپنی اپنی جگہ سیاسی جلسے بھی کئے اور صحیح طور پر فوجی مقابلے کے لئے ایک تنظیم قائم کرنا شروع کر دی۔ ہتھیار صرف اسی علاقے کے لوگ استعمال کرنا جانتے تھے۔ یہی لوگ تھوڑے وقت میں مقابلے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔ وقت اس امر کا فیصلہ کن تقاضا کرتا تھا۔ یہ وقت تاریخی تھا اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے سے ایک قوم کی موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سارے علاقے کا دورہ کیا۔ بظاہر دورہ کرتا تھا مگر دن کو تقاریر کرتا تھا اور رات کو فوجی تنظیم کی تیاری کی جاتی تھی اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ فوج کا مقابلہ فوج سے ہی ہو سکتا ہے کسی اور طرح سے ریاست کے مسلمانوں کی حفاظت ممکن نہ تھی۔

پونچھ میں تنظیمی کام

میں نے اپنی پبلک تقریریں بیباکانہ طور پر پاکستان کے حق میں کرنی شروع کر دی تھیں۔ یہ مئی جون ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ تقسیم ہندوستان لازمی ہو چکی تھی۔ پاکستان کا بننا یقینی ہو چکا تھا۔ ریاست کشمیر میں پاکستان کا نعرہ بغاوت کے مترادف تھا بالواسطہ اب بھی ہم لوگ پاکستان کا نعرہ نہیں لگا سکتے تھے۔ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت جب ہوشیاری سے میں لوگوں کے سامنے رکھتا تو سارا مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ اس کا کوئی علاج حکومت کے پاس نہ تھا اور مجھے گرفتار کرنے کے لئے میری تقاریر میں انہیں مواد نہ ملتا تھا مگر مجھے آزاد چھوڑنا بھی وہ بہت خطرناک خیال کرتے تھے۔ سب ضروری جگہوں پر جا کر میں نے مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اس وقت بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو میری خفیہ پروگرام کی ڈائری وزیر بھیم سین (جو پونچھ کے وزیر اعظم تھے) تک لے جاتے تھے اور اپنی ملازمتیں ڈھونڈتے تھے۔ تاریخی نکتہ نگاہ سے اس سے خطرناک دور کم ہی آئے ہوں گے۔

جس قدر کہ ڈوگروں کو خیال تھا اس قدر ہتھیار ہمارے پاس نہیں تھے بلکہ انہیں محض وہم نے مرعوب کر رکھا تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ ڈوگرہ فوجوں پر غالب آ کر ان کے ہتھیار آسانی سے چھینے جا سکتے تھے۔ اس کا اچھی طرح میں نے اندازہ کر لیا تھا کیونکہ ڈوگرہ فوج کی چوکیوں پر اگر رات کو چھاپا کامیاب ہو جاتے تو بس ابتدا ہو سکتی تھی۔ میں نے علاقے کے بڑے بڑے فوجی افسروں کو خفیہ طور پر علاقہ کی تنظیم کرنے کو کہہ دیا جس طرح فوج میں ایک بٹالین کو ترتیب دی جاتی ہے اس طرح ترتیب وار نام میرے پاس آنے لگے۔ ان معاملات میں میری اپنی معلومات کچھ زیادہ نہ تھی۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان لوگوں کی رہنمائی کرنی شروع

کی۔ ان کی مکمل حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ ہتھیار حاصل کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ سارے علاقہ سدھنوتی اور باغ میں ایک کامیاب تنظیمی پروگرام پھیلا کر اور ذہنی طور پر ان لوگوں کو ایک انقلابی جدوجہد کے لئے تیار کر کے میں سری نگر چلا گیا۔ میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹا جاوید تھے۔ وزیر پونچھ نے شکر کیا کہ یہ اس علاقہ سے جا رہا ہے ورنہ میری گرفتاری کے متعلق ابھی سوچ بچار ہو رہی تھی۔

سری نگر میں پابندی

جب میں سری نگر چلا گیا تو جاتے ہی سری نگر شہر میں مجھے پابند کر دیا گیا۔ شہر سے باہر جانے پر میرے وارنٹ تھے۔ ادھر پونچھ میں میرے جانے کے بعد دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ جتنے بھی سیاسی کارکن تھے ان کو گرفتار کیا جانے لگا۔ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اسی دوران میں حکومت نے ایک نیا ٹیکس لگایا جسے چولہا ٹیکس کہتے تھے۔ یعنی ہر چولہے پر ٹیکس تھا۔ ایک گھر میں چولہے ہوں تو دس پر ٹیکس لگتا تھا۔ اس پر لوگ اور بھی برافروختہ ہوئے۔ اس ٹیکس کی وصولی کے لئے بڑی سختی برتی جانے لگی۔ پونچھ کے گرفتار سیاسی کارکنوں کو سری نگر کی مرکزی جیل میں پہنچانے لگے اور فوج کی کمپنیاں پونچھ بھیجی جانے لگیں۔ مقام فکر ہے کہ جب کسی حکومت کے زوال کی ابتدا ہوتی ہے تو حکومت اپنے ہاتھوں اپنی قبر خود کھودتی ہے۔ ایسے نازک دور میں جب حالات سارے ہندوستان میں ایک عجیب سرعت سے بدل رہے تھے۔ انقلاب کے گھنے بادل پرانی حکومت کے لئے آسمانوں پر منڈلا رہے تھے تو حکومت نے ایک نیا ظالم ٹیکس ایجاد کیا اور اس کی وصولی کے لئے ظالم و جابر ذرائع بروئے کار لانے کا ارادہ کیا مگر نتیجہ جلد ہی سامنے آنے لگا۔

جب پاکستان بنا

پاکستان کا مطالبہ منظور ہو کر اعلان بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ریاست پر بڑی طرح ڈورے ڈالے جانے لگے۔ رام چندر کاک ابھی وزیرِ اعظم تھا۔ وہ دہلی گیا تو دونوں نئی نئی حکومتوں کے لیڈروں سے ملاقات کی اور ایک ایسا بیان دیا جو بین بین انداز کا تھا بہر حال پاکستان کی مخالفت واضح الفاظ میں نہ تھی۔ ہم نے مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کا اجلاس بلایا۔ پونچھ کے حالات نے بڑی تشویش ناک صورت حال پیدا کر دی تھی اور پاکستان کے متعلق بھی فیصلہ کرنا تھا مگر کاک حکومت نے پابندیاں تیز کر دیں۔ ہم سب پر چوبیس گھنٹے کی سی آئی ڈی بیٹھ گئی۔ اجلاس کی شمولیت کے لئے دو سو کے لگ بھگ ممبران ساری ریاست سے سری نگر پہنچ گئے۔ ہمیں اجلاس کے لئے جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ سب ہوٹلوں نے انکار کر دیا۔ سب ہاؤس بوٹ والوں نے انکار کر دیا وہ حکومت سے بھی ڈرتے تھے اور نیشنل کانفرنس والوں سے بھی ڈرتے تھے۔ میر واعظ یوسف شاہ صاحب ہم سے بالکل ہی الگ تھے۔ بلکہ ہماری مخالفت پر اترے ہوئے تھے۔ پریس ہمارے پاس اس قدر مضبوط تھا ہی نہیں البتہ پنجاب کے اخبارات ہر خبر شائع کرنے کے لئے تیار رہتے تھے مگر کچھ عرصہ کے بعد باہر کی اخباروں پر بھی پابندی لگا دی گئی اس اجلاس کے لئے فنڈ، مسلم کانفرنس کے پاس اللہ کے فضل سے کبھی تھے ہی نہیں بڑا نازک وقت تھا اور ہر طرف سے طوفان کے بادل اکٹھے ہو کر منڈلا رہے تھے۔

بالآخر میں نے اپنے مکان پر اجلاس بلانے کی اجازت دی۔ چوہدری حمید اللہ خاں مرحوم مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر تھے۔ میر واعظ یوسف شاہ صاحب کہتے تھے کہ وہ اصل صدر ہیں۔ بہر حال ہمارے لئے چوہدری حمید اللہ مرحوم ہی صدر تھے یہ غلط فہمی کس طرح پیدا ہوئی اس کی ایک الگ گھناؤنی تفصیل ہے۔ جس کا مجھ سے کوئی

تعلق نہیں۔ لہذا اسے نظر انداز کرتا ہوں۔ میں نے اپنا دفتر والا کمرہ صاف اور خالی کر دیا
یہ کمرہ کافی بڑا تھا جس کے فرش پر ہمارے سارے کونسلر لوگ آسانی سے بیٹھ گئے
ان لوگوں میں ایک غفار گوجر صاحب بھی تشریف لائے۔ انہیں ہم نے دعوت نہیں دی
تھی۔ مگر میر واعظ صاحب والے گروپ نے بھیجا تھا مگر کس مقصد کے لئے یہ میرے علم
میں ہرگز نہیں ہے۔ یہ ایک پہلوان قسم کا انسان تھا۔ کافی بلند اور موٹا اتنا تھا کہ دروازے
سے بڑی مشکل سے اندر آسکا اور میں پریشان ہو گیا اس لئے کہ اگر مقصد گڑبڑ کرنا ہے
تو اس پہلوان نے لڑھکنا ہی شروع کیا تو سارے کونسلر اس کے نیچے پس جائیں گے
اور ساری مسلم کانفرنس اس طرح شہید ہو گئی تو پھر کیا ہوگا۔ کسی نے کہا کہ اسے
اندر ہی نہ آنے دو۔ یہ بھی جھگڑے والی بات تھی۔ اس کا باہر رہنا اور بھی خطرناک ہو سکتا
تھا۔ دوسروں کو لاکر ہلڑ ہی مچائے تو پھر بھی بات غلط تھی۔ سری نگر کی سیاست یہاں
تک اتر آئی ہوئی تھی۔ لیڈر لوگ تک ایک دوسرے کو ہاکیوں سے مارتے اور پیٹتے
تھے۔ سارا ماحول سازش اور دھوکہ دہی سے پُر ہو چکا تھا۔

میں نے معاملہ خوب سوچا تو مجھے سمجھ یہ آئی کہ اس پہلوان کے ساتھ لڑائی
بے سود ہے اور کسی قسم کی بدمزگی ہمارے خلاف ہی جائے گی۔ نتائج کچھ ہوں ہمارے
دشمن یہی چاہتے تھے کہ یہ اجلاس بری طرح ناکام ہو جائے۔ رام چند کاک بھی چاہتا تھا
ہری سنگھ بھی یہی چاہتا تھا۔ ہمارے سیاسی مخالف نیشنل کانفرنس والے سری نگر میں
مسلم کانفرنس کا اجلاس برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے غفار گوجر سے کہا "پہلوان
صاحب تشریف رکھئے۔ آپ بھی اجلاس میں تشریف لائے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات
ہے۔ آپ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔" پہلے پہلوان جوتا ہی نہیں اتارتا تھا
حوصلہ افزائی جو ہوئی تو انھوں نے جوتا اتارا۔ میں انہیں پکڑ کر بڑی کمیٹی کے درمیان
لے گیا۔ تاکہ شور ہونے کی صورت میں ان پر قابو پایا جا سکے۔ میں نے پھر انہیں

سگریٹ دیے۔ پانی دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد مجھے تسلی ہوئی کہ یہ ہاتھی اتنا بے قابو نہیں جتنا یہ دکھائی دیتا ہے۔ میری پالیسی اور خوب صورت ڈپلومیسی کام کر گئی۔ پہلوان صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر نہایت پہاڑ کی خاموشی سادھ کر ہماری کاروائی سننے لگے۔

قصہ خود مختار کشمیر کا

یہ کاروائی بڑی طوفانی تھی۔ ایک گروپ ایسا تھا جو چاہتا تھا کہ کشمیر ریاست خود مختار ہو جائے۔ یہ گروپ بدنیتی سے ایسا نہیں کہہ رہا تھا ان کا خیال تھا کہ اگر خود مختاری کا اعلان کر دیں تو ہندوستان ریاست پر ڈورے ڈالنے چھوڑ دے گا اور پاکستان بننے کے بعد یہ خود بخود پاکستان کی جھولی میں چلی جائے گی۔ قائداعظم کی جانب یہ فقرہ منسوب ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا "ریاست کشمیر میری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح گرے گی۔" مگر اس کی تصدیق میں نے کبھی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک دوسرا گروپ تھا جو آزاد یا خود مختار کشمیر کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ تھا اسے پاکستان کے ساتھ غداری کہتا تھا اور مسلم کانفرنس خود مختاری کی سخت مخالف تھی۔ بہر حال بڑی طویل بحث کے بعد پاکستان کے حق میں ریزولیوشن پاس ہو گیا۔ یہ ریزولیوشن بجا طور پر سلامتی کونسل میں بھی پھر اپنے اس جواز میں پیش ہوا کہ مسلمانان کشمیر ریاست کا الحاق پاکستان سے چاہتے تھے کیونکہ ریاست میں مسلمان ۸۰ فی صد آباد ہیں۔ اور مسلم کانفرنس ان کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس ریزولیوشن سے ریاست کے مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ نیشنل کانفرنس والوں کی پوزیشن خطرے میں پڑ گئی اس لئے کہ مسلم عوام پاکستان کے حق میں ہو گئے تھے۔ جس طرح صوبہ سرحد میں ہوا تھا۔ نیشنل کانفرنس عوام میں جا کر اب پاکستان کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ پاکستان

کا مقصد مسلمانوں کی اپنی ریاست کا قیام تھا۔ جہاں قرآن کا قانون جاری ہوگا۔ ریاست کشمیر کے مسلمانوں کے لئے پاکستان کا علاقہ مکے اور مدینے کی طرح متبرک ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۴۷۔۱۹۴۸ء میں کشمیری مسلمان مہاجر ہو کر پاکستان میں پہنچتے تھے تو سرزمین پاکستان کو چومتے تھے۔ یہاں کی مٹی اپنے ماتھے پر لگاتے تھے۔ اس قدر محبت تھی! اور اتنی پاک اور متبرک اور معصوم عقیدت تھی ان کی! مگر یہ عقیدت و محبت اب دس سال کے عرصے میں مفقود ہوتے ہوتے بالکل کم رہ گئی ہے۔ یہ محض ریاستی مسلمان کا حال نہیں بلکہ ہندوستان سے مہاجر ہو کر جو مسلمان آئے ان کا بھی یہی حال ہوا۔ یہاں کی سیاسیات اور اقتصادی حالات سے پریشان ہو کر وہ پاکستان سے بڑے مایوس ہوئے۔ یہ کتنی دردناک کہانی ہے۔ خدا کرے کہ آئندہ —— پھر ایسے حالات ہو جائیں کہ ایمان میں وہی گہرائیاں پیدا ہوں اور عقیدت میں وہی اخلاص پیدا ہو جائے۔

جاوید کی گمشدگی

انہی ایام میں میرے اور میری بیوی کے ساتھ ایک عجیب حادثہ ہوا۔ میرا دوسرا بیٹا خالد ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جاوید ڈیڑھ سال کا ہوگا۔ میری بیوی کمزور رہتی تھی۔ زچگی کی وجہ سے اور بھی کمزور ہو جاتی تھی۔ ہمارا جاوید ہم دونوں کو بہت پیارا تھا اور جب میں کچہری سے واپس آتا تھا تو میرے انتظار میں رہتا تھا۔ میں چائے پی کر اپنے گھر کے چھوٹے سے باغ میں جاوید کے ساتھ چور سپاہی اور خدا جانے کیا کیا کھیلتا تھا۔ یہ کس قدر مسرت بخش بات تھی ہمارا ایک نوکر تھا جو جاوید کو دن کے وقت یا شام کو فرصت پا کر باہر لے جاتا تھا۔ ایک دن اسی معمول سے وہ جاوید کو نزدیک ہی باغ میں لے گیا۔ ہم آبی گزر کے حصہ میں رہتے تھے۔ یہ دریائے جہلم کے کنارے ہائیکورٹ کے نزدیک ایک اچھا علاقہ خیال کیا جاتا ہے

باغ اس گھر سے زیادہ دور نہ تھا اتنے میں نوکر واپس کچھ عرصہ کے بعد بھاگتا ہوا آیا اور اطلاع دی کہ جاوید گم گیا ہے! میں بھاگتا ہوا اس باغ کی طرف گیا اس باغ سے اکیلا جاوید واپس گھر نہ آسکتا تھا کیونکہ کافی دور تھا۔ نوکر سو گیا تھا اور اسی دوران میں جاوید نے بڑی سڑک جو (ایبر اکدل کو جاتی ہے) پکڑ لی ہوگی اور بڑی شاہراہ پر چلا گیا ہوگا ہم نے تلاش شروع کی مگر تلاش کرنے سے کہاں ملنا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ واپس آکر اپنی بیوی کو سہارا دیا۔ پھر تھانہ کی طرف رخ کیا اور وہاں اطلاع دی۔ تھانہ بھی نزدیک ہی تھا۔ پریشانی کے عالم میں چاروں طرف چکر کاٹنے شروع کئے۔ پھر گھر آیا کہ ممکن ہے گھر آگیا ہو۔ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ خدا جانے کتنا وقت گزرا ہوگا۔ وقت کا کسے خیال ہی نہ تھا۔ جاوید سڑک پر پہنچا تو کچھ بسوں کے ڈرائیوروں نے اٹھالیا۔ یہ بسوں کے ڈرائیور پنڈی کے رہنے والے تھے۔ ہوٹل میں لیجاکر چائے پلائی۔ پھر اٹھا کر اسی باغ کی طرف آرہے تھے۔ جہاں سے کہ ملا تھا تو نوکر انہیں راستہ میں مل گیا۔ ایسی پریشانی میری بیوی نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ ماں کی اور بات ہے اور باپ کی اور ہے پھر جب سرینگر سے میری بیوی بچے بھاگ رہے تھے تو اوڑی کے بازار میں جاوید گم ہو گیا اور پھر سڑک پر سری نگر کی جانب جاتے ہوئے ملا تھا۔ راستے میں آتے ہوئے جب یہ پیدل آرہے تھے۔ تو پہاڑ کی چوٹی پر بھینسوں کی اس قدر طوفانی لڑائی ہو کہ اس لڑائی میں جاوید بال بال بچا۔ اس کے بعد میرے دوسرے بچے کے پیدا ہونے میں ایک ماہ باقی ہوگا کہ میری بیوی اسی حالت میں اوڑی سے پیدل چل کر راولا کوٹ آئیں۔ یہ پیدل راستہ پچاس میل ہوگا۔ جبکہ دریا سے پہاڑ کی چوٹی آٹھ ہزار فٹ ہے اور میرے نزدیک یہ معجزہ ہے۔

جب ڈوگرہ فوجوں کے خوف سے میرے بال بچوں نے گھر چھوڑ دیا تو دن اور

رات جنگلوں میں گزارنے لگے۔ ایک جگہ قیام بھی مشکل تھا۔ ان جنگلوں میں اسی پریشانی کے عالم میں میرا دوسرا فرزند خالد پیدا ہوا اور جس دن خالد پیدا ہوا۔ اسی دن راولاکوٹ کے محاذ پر آزاد فوجوں نے ڈوگرہ فوجوں کو شکست دی جب راولاکوٹ کو چھوڑ کر یہ فوجیں پونچھ شہر کی جانب کوچ کر گئیں تو ساری راہ آزاد فوجوں نے ان کا تعاقب کیا۔

مجاہدین پونچھ

پونچھ سے بڑی پریشان کن خبریں آنے لگیں۔ سیاسی قیدیوں کی لاریاں بھر بھر کر سری نگر کے جیل بھرے جانے لگے۔ امیرا کدل کے بازار میں ان پونچھ کے سورماؤں نے بیباک ہو کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ حکومت کے پاؤں لڑکھڑا گئے ساری ریاست کو ان پونچھ والوں سے ایک قدرتی ہمدردی اس لئے تھی کہ پونچھی بہادر ہیں۔ شیخ عبداللہ پونچھ والوں کے بڑے مدّاح ہیں۔ پونچھ والوں کے حق میں شیخ عبداللہ نے ۱۹۴۷ء میں دہلی سے اگر بیان دیا تھا جو ان کے خلاف سلامتی کونسل میں سر ظفر اللہ خاں نے بار بار پیش کیا اور خوبی کی بات ہے کہ شیخ عبداللہ نے اپنے بیان سے کبھی انحراف نہ کیا۔ یہ بڑی جراًت کی بات بھی ہے۔ شیخ عبداللہ میں بڑی اخلاقی جراًت ہے۔ صحیح لیڈر شپ کے معیار پر اترنے والے آدمی ہیں۔ جب سری نگر میں ان پونچھی لیڈروں نے پاکستان کے نعرے لگائے تو سارا سری نگر شہر ایسے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

مجھے یہ بات بے حد ستانے لگی کہ اگر پونچھ ہمارا آہنی بازو ڈوگرہ فوجوں نے بیکار کر دیا تو آئندہ لڑائی کیسے ہو سکے گی۔ میری طرف سے ان لوگوں کو اس قدر واضح الفاظ میں یقین دہانی تھی کہ تکلیف کے وقت میں ان میں رہوں گا میرے

لئے اخلاقی طور پر کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنی جان پر بھی کھیل کر ان لوگوں میں ان کی رہنمائی کے لئے چلا جاؤں اگرچہ حکومت کی پابندی بڑی سخت تھی اور میرے گھر کے ساتھ ہی ایک بجلی کے کھمبے کے ساتھ ایک کشمیری پنڈت انسپکٹر کھڑا رہتا تھا اور معلوم تھا کہ یہ کون ہے۔ جو چوبیس گھنٹے کی کڑی نگرانی کرتا ہے۔

سری نگر سے روانگی

ادھر رامچندر کاک کو وزیر اعظم کے عہدے سے الگ کر دیا گیا کیونکہ وہ زیادہ تر پاکستان کی جانب جھکا ہوا معلوم ہوا۔ ایک ڈوگرہ فوجی افسر کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ یہ مہاراجہ صاحب کی برادری کا پرانا فوجی افسر تھا جو وزیر بھی رہ چکا تھا۔ ان کا نام جنگ سنگھ تھا وہ بوڑھا آدمی تھا اور کوئی عقل و ہوش کی بات اس سے سرزد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مہاراجہ صاحب کو اب انہیں پر اعتماد ہو سکتا تھا۔ یہ کٹر قسم کا ڈوگرہ تھا اور پونچھ کے حالات سے سخت پریشان تھا۔ چودھری حمید اللہ صاحب اور میں انہیں جا کر ملے۔ مگر اس کی بات نہ ہمارے پلے پڑی اور نہ ہی ہم اپنا مطلب انہیں سمجھا سکے۔

آغا شوکت علی صاحب جو مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ گرفتار ہو چکے تھے۔ ان دنوں پیرول پر رہا ہو کر آئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے جا کر گلمرگ میں کچھ پاکستانی دوستوں سے مشورہ کیا جن میں فیض احمد فیض اور ہاشمی صاحب بھی تھے جو آج کل ترقیاتی کمیشن میں ہیں۔ دوسرے دن پھر سری نگر میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر (جو اس وقت محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر تھے یا کالج کے پرنسپل تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں) کے مکان پر ان سارے حضرات سے ملاقات ہوئی اور سب نے متفقہ طور پر مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں جس طرح بھی ہو سکے پونچھ جا کر تحریک کو زندہ

رکھوں۔ یہ بھی طے پایا کہ میں اور آغا شوکت علی دونوں ریاست سے باہر راولپنڈی میں چلے جائیں اور وہاں رہ کر پونچھ کی تحریک کو مضبوط کریں۔ اس پر سب کا اتفاق ہوا۔ جاوید ان دنوں عارضہ بخار میں مبتلا تھا۔ میں نے ڈاکٹر نور حسین صاحب سے کہا کہ وہ میرے بچے کا خیال رکھیں۔

جب دوسرے دن جب میں آغا شوکت علی سے ملنے گیا تو ان کی کوٹھی کے چاروں طرف پولیس کھڑی تھی۔ انہیں جیل واپس لے جا رہے تھے۔ میں وہیں سے واپس آ گیا۔ دن بھر عدالت میں نہ گیا کیونکہ حکومت کو ہماری ساری بات کسی طرح معلوم ہو گئی تھی۔ میرے منشی نے عدالت میں مشہور کر دیا کہ میں باہر کسی عدالت میں کیس کرنے گیا ہوا ہوں۔ رات کو میں دس بجے کے لگ بھگ گھر آیا۔ جاوید ابھی تک اسی طرح بیمار تھا۔ میری بیوی بستر پر بے صبری اور بے قراری میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ میں انہیں چھوڑ کر اسی رات باہر جا رہا ہوں پھر میں نے معمولی سا کھانا کھایا۔ اپنے کپڑے بند کئے اور جاوید کو پیار کر کے خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ یہ یقین نہیں تھا کہ انہیں پھر مل سکوں گا مگر سوچنے کا وقت کہاں تھا۔ سارا ملک ایک طوفان سے گزر رہا تھا۔ زندگی کسی کی کسی جگہ بھی محفوظ نہ تھی۔

میری ٹیکسی کا انتظام راجہ حمید خاں مظفر آباد والے نے کیا تھا۔ راجہ حمید خاں بڑے مخلص لوگوں میں سے ہیں۔ میری حکومت ۵۹۔۱۹۵۷ء میں میرے ساتھ وزیر بھی رہے ہیں۔ رات کو میں سلطان صاحب حسن علی خاں بونچ کی ہاؤس بوٹ میں رہا۔ ۳ بجے صبح ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں نے سری نگر شہر کو خیر باد کہا۔ معمولی سی بارش تھی اور گھپ اندھیرا تھا جب بادل نخواستہ روانہ ہوا۔ دیکھتے دیکھتے امیرا کدل کا پل اور اونچی اونچی دیواریں مکانوں کی پیچھے پیچھے رہتی گئیں۔ ان دیواروں

کے پرے ایک مکان میں ننھا جاوید کس طرح ہو گا۔ یہ خیال دور تک پریشان کرتا رہا۔

چناری اگر میں نے باقاعدہ ڈاک بنگلے میں چائے پی پھر دومیل آگے کسٹم ہاؤس کے سامنے کھڑے ہوئے تو کسی نے ٹیکسی کے اندر نہ کچھ دیکھا اور نہ پوچھا۔ مظفر آباد شہر سے گزر کر برار کوٹ تک جلدی ہی پہنچ گئے۔ اس وقت دن کے نو بجے ہوں گے جب برار کوٹ کی سرحد پر آکر گاڑی پھر کھڑی ہو گئی تو میں فوراً اتر کر پاکستان کی سرحد کی جانب آگیا۔ میری پریشانی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ سرینگر پولیس کو میرا ٹیلیگرام جانے پر علم ہوا کہ میں ایبٹ آباد پہنچ بھی گیا ہوں۔ یہ ٹیلی گرام میں نے اپنی بیوی کو اطلاع دیا تھا۔

بعد میں کئی لوگوں نے یہ مشہور کیا (وجوہات قطعاً معلوم نہیں) کہ میں سری نگر سے برقع پہن کر نکلا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ البتہ سری نگر والی میٹنگ میں ڈاکٹر تاثیر کے ہاں یہ بات ضرور زیرِ بحث لائی گئی تھی کہ میں برقع پہن کر نکلوں ورنہ میرا ریاست سے باہر جانا ممکن نہیں ہے۔ میں نے فوراً ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اگر میں برقع پہنے ہوئے پکڑا جاؤں گا تو پھر میری ساری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ایسا کرنا بہرحال میری خودداری کے سخت منافی اور غیرت کیلئے چیلنج تھا۔

حصّہ چہارم

چراغِ حریت ۔ ۱

میں سری نگر سے ۲۲ر۲۳ اگست کو پاکستان کی طرف روانہ ہوا اور جیسا کہ کہہ چکا ہوں راستہ میں مجھے کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ کیونکہ پولیس کو بروقت اطلاع ہی نہ مل سکی کہ میں ریاست سے باہر جا رہا ہوں۔ اس سلسلے میں بعد میں پولیس کے کئی افسر معطل بھی کر دیے گئے۔ میری نگرانی کے لئے پرائیویٹ اور پولیس کی سی آئی ڈی کام کر رہی تھی۔ کسی بھی ایجنسی کو وقت پر معلوم نہ ہو سکا کہ میں سری نگر سے باہر جا رہا ہوں۔ گو آغا شوکت علی کے متعلق حکومت کو فوراً اطلاع ہو گئی۔ انہیں گرفتار کر کے واپس جیل لے گئے۔ لہذا جب اس کا علم ہوا تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔

مجبوراً میں پاکستان چلا آیا تو میرے بچے یعنی جاوید اور اس کی والدہ وہیں رہ گئیں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ان کے ساتھ میرے دوسرے ایک رشتہ دار بھی تھے۔ اور میرے بھائی اسماعیل خاں کا بڑا بیٹا نذیر بھی ساتھ تھا۔ یہ بچہ وہاں سکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ابھی کم عمر ہی تھا۔ ستمبر کے مہینے میں میرے بھائی اسماعیل خاں جب انہیں سری نگر لینے کے لئے گئے تو ان کی بڑی کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ ان بچوں کی وجہ سے ریاست میں واپس آؤں گا۔ ان پر ایک پرائیویٹ سی آئی ڈی کا آدمی تعینات کیا گیا جب بھائی صاحب وہاں گئے تو انہیں ان مشکلات کا علم ہوا۔ میرے بھائی اسماعیل خاں ہر کام میں بڑے دور اندیش اور معاملہ فہم واقع ہوئے تھے لہذا انہوں نے بھی یہی سوچا

کہ اگر دانائی سے نہ نکلیں گے تو معاملہ مشکل ہے اس لئے انہوں نے کسی اور کے نام سے سیٹیں لاری میں اوڑی تک بک کرائیں دوسری طرف یہ کام کیا کہ دروازہ مکان کا کھلا چھوڑ کر ذکر سے کہہ دیا شالیمار سیر کو جا رہے ہیں۔ اس طرح یہ چپکے سے اوڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اوڑی پہنچ کر اپنی پریشاں حالی کی وجہ سے چھوٹے جاوید کو ہی کھو بیٹھے جو پھر دیر بعد جا کر انہیں ملا۔ اس وقت میری بیوی زچگی کی حالت میں تھیں میرا دوسرا بچہ خالد ہونے والا تھا۔ میری بیوی کی طبیعت اس لئے کمزور رہتی تھی اپنے ان حالات اور پریشانیوں کی وجہ سے میری بیوی بہت ہی کمزور اور نحیف اگرچہ تھی۔ اوڑی سے ہمارے گھر کا راستہ پیدل تھا۔ یہ راستہ اوڑی سے داولاکوٹ تک کم و بیش پچاس اور ساٹھ میل کے لگ بھگ ہو گا۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ اوڑی سے چڑھائی چڑھتے چڑھتے ۸ ہزار فٹ کی بلندی تک جانا پڑتا ہے اور پھر دوسری طرف اترائی شروع ہوتی ہے۔ نالے میں پہنچ کر داولاکوٹ کی طرف پھر چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ یہ پہاڑ سات ہزار کی بلندی کا ہے جس پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اس بلندی پر چڑھنے اترنے کے علاوہ ڈوگرہ فوجوں کا خطرہ ہر طرف سے لاحق ہو رہا تھا۔ پھر سکھوں کا خطرہ بھی موجود تھا اگرچہ ابھی سکھوں اور مسلمانوں کا آپس میں کوئی فساد نہ ہوا تھا مگر ان علاقوں کا ماحول خطرات سے خالی ہرگز نہ تھا۔

پانچ روز متواتر سفر ہوتا رہا۔ جاوید کو اٹھانا پڑتا تھا کیونکہ خود وہ بھی چل نہیں سکتا اس کی عمر ڈیڑھ سال ہی غالباً تھی۔ مزدور بھی نہ ملتے تھے۔ کیونکہ گھروں میں لوگ پریشان سے بیٹھے تھے۔ مزدوری کی کسے خواہش تھی ایک آدمی جو ساتھ تھا اس نے معمول سے سامان اٹھائے رکھا تھا۔ جس مصیبت سے میری بیوی اس دور میں گزری۔ اس کی بھی مثال آسانی سے نہیں ملتی اور جس جرأت و ہمت کا ثبوت میری بیوی نے اس لمبی منزل میں اس حالت میں دیا۔ میں اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنی بیوی

سے بے حد پیار ہے اور جب یہ تفصیل مجھے معلوم ہوئی تو ہفتوں تک یہ پریشانی میرے ذہن پر سوار رہی۔

راولاکوٹ پہنچ کر میری بیوی نے دیکھا کہ ان کے والد گرفتار ہو چکے ہیں اور کسی نامعلوم منزل کی طرف لیجائے گئے ہیں خود ان کا گھر اور باقی سب جگہ ڈوگروں کے ملٹری کیمپ کے بے حد نزدیک تھی۔ کچھ دنوں بعد میرے سسر کے مکانات نذرِ آتش کر دیے گئے۔ ان کی دکانوں کو جلا دیا گیا۔ سارے راولاکوٹ کے بازار کو بھی نذرِ آتش کر دیا گیا۔ میرے سسرال والے چھ ماہ تک دربدر رہے۔ کوئی مکان ان کی رہائش کے لئے نہ تھا نہ ہی کھانے کے لئے کچھ تھا یہ وقت ان پر جس طرح گزرا، ایک الگ تفصیل ہے جنگ بند ہونے کے بعد میرے سسر حاجی محمد قاسم خاں جموں جیل سے رہا ہو کر آ گئے جبکہ اور بھی کئی سیاسی قیدی رہا ہو کر آئے تھے۔

اس سارے علاقہ میں یہی لوگ نہیں تھے جن پر یہ مصائب نازل ہوئیں بلکہ یہاں کے سینکڑوں لوگ تھے۔ جنہیں باغیوں کی حیثیت سے قید کیا گیا۔ ان کے بال بچوں کو بھی سخت اذیتیں دی گئیں یا اٹھانی پڑیں بعد ہی تو پھر اس علاقہ کے ہزاروں انسان یا میدانِ جنگ میں کام آئے یا زخمی اور ناکارہ ہو کر آج تک مصیبت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سیاسی قیدیوں میں سے ابھی تک کئی ڈوگروں کی قید بھگت رہے ہیں یا مارے گئے ہیں جن کا علم نہیں ہے۔ کئی قیدی جیل سے رہا ہوئے کو راستہ میں سکھ اور ہندو فوجوں نے انہیں بے رحمی سے قتل کر دیا۔ آزاد کشمیر کے تقریباً سب لوگوں اور سارے علاقے نے قربانی دی ہے اور دل کھول کر جہاد میں حصّہ لیا ہے پھر مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ جیسی حیثیت کے سیاسی لیڈر اس وقت بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر لے کے باوجود مصروف جدوجہد ہیں۔ شیخ عبداللہ نے ۱۹۵۳ء کے بعد جس کردار کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی تعریف کئے بغیر

کوئی نہیں رہ سکتا۔ شیخ عبداللہ کا ضمیر خریدا نہیں جا سکا۔ اگرچہ ہندوستان نے ہر طرح کی کوشش کی اور اب بھی جاری ہے۔ اس میں شیخ عبداللہ کی بیگم کا بڑا ہاتھ ہے خدا کرے کشمیر آزاد ہو اور پھر ان لوگوں کو اپنے ملک میں خود حکومت کرنے کا صحیح موقعہ ملے۔ کشمیر کی دو ہزار سال کی تاریخ بڑی گھناؤنی ہے کیونکہ ظلم و تشدد سختی اور بیرحمی کی تاریخ کے سوا کشمیر کی تاریخ ابھی تک اور کچھ نہیں بن سکی۔

میں ایبٹ آباد میں ایک رات گذار کر سیدھا راولپنڈی آیا۔ ایبٹ آباد میں ہو کر میں نے اپنے سیاسی کارکنوں کو مختلف مقامات پر ہدایات بھیجتا آیا مگر ایسے محتاط طریقہ سے کہ ان کی حالت خطرہ میں نہ پڑے۔ بہر حال میں نے سب کو اطلاع دے دی کہ میں سری نگر سے نکل کر پاکستان میں آگیا ہوں، اور جو بھی ہو سکے گا، کر دوں گا۔ مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے حوصلے پست نہ ہوں۔ پھر راولپنڈی میں قیام کر کے میں نے مزید ہدایات اپنے لوگوں کو بھمبر سے لے کر مظفر آباد تک دینی شروع کر دیں۔ میں نے راولپنڈی میں آکر ایک میٹنگ بلائی۔ جس میں میں نے آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ راولپنڈی میں پونچھ کے عام لوگ بہت ہوتے ہیں، ان لوگوں کے ذریعہ میں نے سب کو اطلاع کر دی۔ ابھی تک راستہ کی آمد و رفت بند نہ ہوئی تھی۔

لاہور میں ـــــ امداد کے لئے

یہاں چند یوم قیام کرنے کے بعد میں سیدھا لاہور چلا آیا اور یہاں اخبار والوں سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں ریاست کے مکمل حالات اور پس منظر سے آگاہ کیا اور انہیں یہ بھی بتایا کہ آئندہ ساری ریاست کے مسلمان کس قسم کے خطرات میں گھر چکے ہیں ادھر لاہور میں ابھی مشرقی پنجاب سے مہاجرین نے آنا شروع کر دیا تھا۔ مشرقی پنجاب میں قتل و غارت گری شروع ہو چکی تھی۔ لاہور کا ریلوے سٹیشن ایک محشر کا منظر تھا

سارے پاکستان میں ایک طوفان کی صورت نظر آرہی تھی۔ حکومت نے ابھی قدم جمائے ہی نہ تھے اور کسی کو معلوم ہی نہ تھا آئندہ کیا ہوگا کئی افسران ہندوستان سے ہی ابھی تک منتقل ہو کر نہیں آسکے تھے۔ سکھ فوجیں راولپنڈی اور لاہور کی چھاؤنیوں میں کھڑی تھیں۔

لاہور میں آکر میں نے میاں امیر الدین اور راجہ غضنفر علی خان کے ذریعہ سے قائداعظم کو ملنے کی بڑی کوشش کی مگر قائداعظم تک یہ لوگ جاتے ہوئے ڈرتے تھے لہذا مجھے قائداعظم تک کون پہنچا سکتا تھا۔ قائداعظم مہاجرین کی آمد سے خود پریشان تھے۔ بہرحال اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ آخر یہ سب تفصیل کسے سنائی جائے یا کس سے امداد طلب کی جائے۔ کوئی ایسا شخص بھی نہ تھا جس سے مشورہ ہی حاصل کیا جائے۔ ادھر جب وطن کا خیال آتا تو پیٹ کی آنتڑیوں تک درد محسوس ہوتا کہ کیا ہمارا بھی یہی حشر ہوگا۔ جو مشرقی پنجاب کے مہاجرین کا میں دیکھ رہا ہوں؟ کیا اس طرح لوگ دریائے جہلم کے اس کنارے پر قتل ہو جائیں گے؟ اور یہ مسلمانوں کی مملکت ان کے لئے کچھ نہ کر سکے گی؟ جہاں جہاں بھی مجھے پونچھ کے سپاہی پاکستان فوج میں ملے۔ انھیں اپنے ہتھیار ساتھ لے کر وطن پہنچنے کے لئے میں نے حکم دے دیا۔ یہ بات آگ کی طرح سارے ملک پاکستان میں پھیل گئی۔ پھر پاکستان کے اخباروں نے بھی معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ تمام ریاست کے سپاہیوں کو اپنے وطن کی فکر پڑی۔ بندوق ساتھ لی۔ اس کے ساتھ ایمونیشن لیا اور وطن کی طرف بھاگ پڑے کہ کہیں یہ معاملہ مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی طرح ان کے علاقے میں بھی عام نہ ہو جائے کیونکہ کشمیر ابھی ہندوستان نہیں تھا بلکہ انہی لوگوں کا تھا جو یہاں بستے تھے اور ان کا قتل عام کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لاہور کی گلیوں میں امداد کے لئے مارا مارا پھرا مگر اس سے کیا حاصل ہوتا لہذا

وطن کے خیال سے پھر بھاگ کر مری پہنچا تاکہ کوہالہ تک جا کر دیکھ سکوں کہ آخر اب کیا ہو رہا ہے۔ مری میں آکر میں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ یہاں کئی دوستوں نے ہوٹل میں مجھے دو کمرے مفت دے دیئے۔ جہاں سے بڑا حصہ آزاد کشمیر کا دکھائی دیتا ہے ابھی آمد و رفت جاری تھی۔ مگر تمام پلوں پر ڈوگرہ فوج پہرہ دے رہی تھی۔ ان میں سے کچھ مسلمان افسر اور سپاہی بھی تھے۔ کئی ان میں جرأت کرتے ہوئے راولپنڈی میں آکر مجھے ملے بھی مگر فوری طور پر کوئی پروگرام ایسا نہ تھا، جو انہیں میں دے سکتا تھا۔ ڈوگرہ فوج دریائے جہلم کے کنارے میرپور تک اور پھر سیالکوٹ تک تعینات ہوگئی تھی۔ مری میں پونچھ میرپور اور مظفر آباد کے لوگ مجھے مل سکتے تھے۔ لیکن ابھی تک ذہن میں یہ بات واضح طور پر نہیں آئی تھی کہ کیا جائے۔

ڈوگروں کے خلاف بغاوت

مری میں کچھ ایسے دوست مل گئے جن کا مشورہ بے حد کارآمد تھا اور وقعت رکھتا تھا۔ ہمارے میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ڈوگرہ فوج کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے کیونکہ حکومت کے خلاف بغاوت کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ادھر حکومتِ پاکستان کے ساتھ ریاست کے وزیر اعظم کا معاہدۂ عارضی بھی ہو چکا تھا اور جونہی حالات بدلنے شروع ہوئے وزیرِ اعظم پاکستان نے ریاست کی حکومت کو سختی سے مسلمانوں کا قتلِ عام بند کرنے کی تنبیہہ بھی کی۔

میں نے اپنے رسوخ اور جدوجہد کا دائرہ وسیع کر دیا۔ دوستوں نے مل کر ہتھیار ہر قسم کا اسلحہ اور بارود جمع کرنا شروع کر دیا اور دیسی بندوقوں کا سامان تیار کرنے کی فیکٹری کوہالہ کے اس پار کھول دی تاکہ فی الحال تو مقابلہ کے لئے عوام کے ہاتھوں میں کچھ آجائے۔ ریاست میں حکومت نے منظم طور پر عوام الناس کو خوف

خوف و ہراس دلا کر ہتھیار جمع کروائے تھے۔ یہ ہتھیار زیادہ تر تھانوں میں ہی ابھی جمع کئے گئے تھے۔ لہذا آہستہ آہستہ دریائے جہلم سے راتوں رات سامان کی ترسیل منظم طریق سے شروع کر دی گئی اور دریا کے ساتھ سارے علاقہ پونچھ اور مظفر آباد کے ساتھ الحاق پیدا کر دیا گیا۔ میں نے دریائے جہلم کو دو بار شیناؤں (جو بکرے کی کھال میں ہوا بھر کر بنتی ہیں) پر رات کے وقت عبور کیا اور مشورے کرنے اور ہدایات دینے کے بعد واپس علاقہ پاکستان میں آگیا۔ اس دور میں علاقہ پاکستان کے نیز اک لوگوں نے ہر لمحہ میری امداد کی۔ ان کے اخلاص، جرأت اور ہمدردی کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ یہ لوگ تحصیل مری میں کھیدر پل کے ساتھ رہتے ہیں اور زیادہ تر ستی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

آزاد قبائل کی آمد

پھر مجھے سرحد اور پشاور سے لوگوں نے ہتھیار بھی لا کر دینے شروع کئے اور ہم لوگوں نے خود بھی خریدنے شروع کئے۔ اس سارے انقلاب اور جنگ کے دور میں پٹھانوں نے ہماری جتنی امداد کی۔ اس کی کم ہی مثال ملے گی۔ جس طرح کہ قبائلی لوگوں نے ریاست کشمیر میں آکر ایک اڑے وقت میں اہل ریاست کی امداد کی اور ان کے خون کے ساتھ اپنا خون بہایا۔ کشمیر کے عوام الناس اور آنے والی نسلوں کو اور ان کی حکومتوں کو یہ معاملہ کبھی بھی اپنے دل سے فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ قبائلی اور دوسرے پٹھانوں نے ہماری ایک نازک دور میں دل کھول کر امداد کی تھی اور ہماری جگہ اگر خون بہانے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ آج بھی آزاد کشمیر میں ان کے داخلے پر کئی وجوہات سے پابندی ہے۔ بہر حال اگر کچھ پٹھان لوگ وہاں اگر کاروبار کریں تو ان کے ساتھ مروت، ہمدردی اور برادرانہ سلوک ہونا چاہیئے۔ آزاد کشمیر

میں نئے نئے افسر تعینات ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں اس پس منظر سے کوئی واقفیت نہیں۔ لہٰذا ان پٹھانوں سے سختی سے پیش آتے ہیں جو جائز نہیں ہے۔

کچھ دوست سری نگر میں حالات کا پتہ لگانے گئے۔ یہ ستمبر کی بات ہے جب مجھے وہاں سے یہ رپورٹ آئی کہ عوام بغاوت کے لئے تیار ہیں۔ صرف ان کی بروقت امداد ضروری ہے۔ ریاست میں فوج نے سختیاں زیادہ کر دیں۔ خصوصاً پونچھ کے علاقہ میں دو ایک جگہ سخت تصادم بھی ہو چکا تھا۔ یہ سب ایک آنے والے خطرہ کا پیش خیمہ تھیں۔ فوری طور پر ڈوگرہ فوج غالب آگئی تو لوگ دب گئے مگر پھر انتظار کرنے لگے۔ پونچھ میں بغاوت کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ جس کے متعلق ہدایات میں نے نہایت ہی قابلِ اعتبار اور معتمد افسروں کے ذریعے سے دی تھیں۔ لوگوں نے میرا حکم ایسے ماننا شروع کیا کہ چند راتوں کے دوران ہی ایک ایسی تنظیم کھڑی ہوگئی جو برسوں کی ٹریننگ کے بعد بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک جانی خطرہ جب سامنے نظر آئے تو پھر موت سے پہلے ہر آدمی کو ہر خطرہ مول لینے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے لئے آسانی یہ تھی کہ سارے سدھنوتی اور باغ کے علاقہ کے لوگ بڑی اکثریت میں فوجی سپاہی تھے۔ جن کے لئے صرف حکم کی دیر تھی کہ وہ ایک اچھے خاصے فوجی نظام میں منسلک ہو گئے۔

کچھ سامان ہم نے ان تک پہنچا دیا۔ کچھ مقامی طور پر فراہم کیا گیا۔ یہ تیاری اس رازداری سے ہوئی کہ میں خود حیران ہوتا ہوں کہ ڈوگروں کو اتنا چوکنا ہونے کے باوجود اتنی بڑی تیاری کا علم کیوں نہ ہوا؟ شاید یہ بات تھی کہ عوام الناس، ڈوگرہ پولیس اور فوج کا تعلق اب قطعی طور پر ختم ہو چکا تھا اور جسے ڈوگرہ حکومت امن سمجھتی تھی وہ محض ایک طوفان سے قبل کی خاموشی تھی۔

۸ اکتوبر سنہ ۴۷ء کو معمولی سی ایک جھڑپ ہوگئی جس سے ڈوگرہ حکومت ہوشیار ہوگئی۔ باغ کے علاقہ میں اس جھڑپ کے دوران ۳۰۳ کی گولی کے

استعمال سے ڈوگرہ حکومت کو علم ہوا کہ باغیوں کے پاس پکی رائفلیں بھی ہیں۔ انہوں نے مزید فوج اور سامان کوہالہ کے راستے سے آگے بھیجنا شروع کر دیا۔ دو تین جگہ اور بھی جھڑپیں ہوگئیں مگر وہ بھی بے صبری کی وجہ سے سرزد ہوئیں۔ لوگوں کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ ان ڈوگرہ فوجوں سے ہتھیار چھین کر انہیں شکست دینا چاہتے تھے۔ اس بے صبری کی وجہ سے ڈوگرہ اپنی پوزیشن اور مضبوط کر گیا اور اپنی جگہ گڑھے کھود کر مضبوطی سے جم گیا۔ انجام کار ہمارے سپاہیوں نے ان پر حملے کئے تو انہوں نے ہمارے سپاہیوں کو مشین گنوں سے جواب میں چھلنی کر کے رکھ دیا، اور بڑی قربانیوں کے بعد ان مورچوں پر قبضہ کیا گیا۔ کچھ ہتھیار ہماری فوج کے ہاتھ آسکے۔ اور ایسا کئی جگہوں پر ہوا۔

اسی دوران جموں میں مسلمانوں کے لئے خطرات بڑھتے گئے۔ جموں شہر کے لئے بھی رائفلوں کا انتظام کیا گیا۔ مگر کہتے ہیں کہ ان میں سے بہت کم وہاں پہنچ سکی تھیں۔ اگر وقت پر پہنچ جاتیں تو جموں کے مسلمان یقیناً مقابلہ کرتے۔ ان میں جرأت اور قوت مقابلہ ضرور تھی۔ ہندو فوج بھی وہاں کوئی زیادہ نہ تھی۔ اگر پاکستان کی ایک بٹالین فوج جموں اور سری نگر روانہ ہو جاتیں تو ساری ریاست کشمیر ہمارے قبضہ میں تھی مگر ایسا کرنے کے لئے غیر معمولی ایثار کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ کثیر اسلحے کی ضرورت تھی۔ یہ دونوں چیزیں پاکستان کی پریشانی کی وجہ سے یکجا موجود نہ تھیں۔ قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے حسبِ معمول جرأت کی مگر کچھ لوگوں نے ساتھ نہ دیا جس کا ذکر آگے ہوگا۔

۲۲ اکتوبر سے ریاست میں باقاعدہ بغاوت ہوگئی۔ قبائلیوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ مظفر آباد سے باقاعدہ لڑائی شروع ہوئی اور سری نگر کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈوگرہ فوجوں کے مسلمان افسروں اور سپاہیوں نے ہمارا ساتھ دیا، اور اچھے وقت پر ساتھ

دیا جبکہ ان میں سے کئی افسر ہمارے ساتھ آملے۔ لڑائی کی ترتیب اور تنظیم میں بڑا حصہ لیا، اور کئی تو میدانِ جنگ میں بھی کام آئے! اور آج بھی آزاد کشمیر کی فوجوں میں ان میں سے کئی خدمات انجام دے رہے ہیں پھر لداخ، گلگت اور ریاست کے دوسرے حصوں میں بھی بغاوت ہو گئی۔ پونچھ میں ۲۷ اکتوبر سے بغاوت کا آغاز ہو چکا تھا اور ۲۷ اکتوبر سے پہلے کھائی گالہ میں ستمبر میں ایک بڑا معرکہ ہو چکا تھا۔ جہاں نہتے لوگوں نے محض معمولی ہتھیاروں اور پتھروں سے ڈوگرہ فوج پر حملہ کیا تھا اور اس میں کئی ضعیف مرد۔ عورتیں اور بچے شہید ہو گئے۔ دراصل جنگِ آزادیِ کشمیر کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

آزاد حکومت

۲۴ اکتوبر کو جب ریاست کا کافی علاقہ آزاد ہو گیا، تو میری قیادت میں ایک حکومت کی تشکیل کی گئی اور اس کا اعلان ہو گیا۔ دنیا کے ریڈیو اور پریس نے اس خبر کو مشتہر کیا۔ اس حکومت نے نئی حکومت کی تشکیل کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ ڈوگروں کی حکومت ساری ریاست میں منسوخ کر کے نئی حکومت ریاست کا نظم و نسق سنبھال رہی ہے۔ یہ حکومت اپنے عوام کے ساتھ فیاضانہ سلوک کریگی۔ ہندوؤں کے حقوق کی حفاظت کرے گی۔ اس حکومت نے ہندوستان سے بھی اپیل کی کہ وہ اس حکومت کو تسلیم کرے اور اس کی امداد کرے کیونکہ یہی عوام کی صحیح حکومت ہے۔ ڈوگرہ شاہی ریاست کشمیر سے ختم ہو چکی ہے۔ اور مہاراجہ ہری سنگھ سری نگر سے تخت و تاج چھوڑ کر بزدلانہ طریق سے بھاگ چکا تھا۔

مگر ہندوستان نے مہاراجہ سے سازباز پہلے سے کر رکھی تھی۔ عرصہ سے خفیہ بات چیت ہو رہی تھی۔ ہندوستانی حکومت کے سیکرٹری مینن فوراً دلی سے ہوائی جہاز پر سرینگر پہنچے۔ حالات کا جائزہ لیا۔ جموں جا کر ہری سنگھ سے الحاق نامہ پر دستخط کرا لئے۔ اور

نئی دہلی سے الحاق کا اعلان ہوگیا۔ حکومت پاکستان نے اس الحاق نامے کو دھوکہ دہی اور بد دیانتی کے ناموں سے یاد کیا اور اس الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ہندوستان پر بھی یہ معاملہ واضح کر دیا گیا۔

۲۷ اکتوبر کو ہندوستان کی فوجیں سری نگر میں ہوائی جہازوں کے ذریعہ اتر آئیں۔ آزاد فوجوں کی اور ان کی لڑائی بارہ مولا اور پٹن پر ہوتی رہی۔ ہندوستانی فوجوں کو پہلے مرحلے میں بری طرح شکست ہوئی۔ ان کا کمانڈر بھی مارا گیا۔ پہلی کماؤں بٹالین ساری کی ساری ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد ساری ریاست میں باقاعدہ ہندوستان کی فوجوں سے لڑائی شروع ہو گئی۔ ریاست کا بیشتر علاقہ بغاوت کرنے سے آزاد ہو گیا۔ لداخ اور گلگت مکمل آزاد ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء کے دوران جب آزاد فوجوں کی ہندوستان سے لڑائی ہوتی رہی۔ بیشتر علاقہ آزاد ہوتا گیا اور جنوری ۱۹۴۹ء میں سلامتی کونسل میں مقدمہ گیا تو ریاست کا ۲/۳ حصہ آزاد حکومت کشمیر کے پاس تھا اور سوائے سری نگر اور جموں کے شہروں کے باقی حصہ ریاست میں مقبوضہ کشمیر کی حکومت کا دخل کم ہی تھا۔

قائد اعظم اور کشمیر

نومبر کے مہینے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لاہور میں بات چیت ہونے والی تھی کہ بارہ مولا سے ہماری فوجیں پیچھے ہٹ آئیں مگر پنڈت نہرو نے بات چیت کو ٹال دیا اور سلامتی کونسل میں اپنا کیس لے گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کے حالات نہایت کشیدہ ہو چکے تھے، جنگ کا خدشہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے لئے کوئی ملک بھی تیار نہ تھا۔ محض جنگ کا ایک خطرہ سالاحق ہو رہا تھا۔ اگر ریاستِ کشمیر پر مکمل حملہ ہو جاتا تو نتائج کچھ اور ہوتے۔ اس دوران میں قائد اعظم نے اپنی فوجوں کو سرنگر

اور جموں پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ نگران کی حکومت کے ممبران ان سے اتفاق نہ کر سکے۔ قائد اعظم نے خود بتایا، اور بڑے غصے سے کہا تھا کہ محض حکومت کے ممبران کی کم ہمتی کی وجہ سے ایسے ہوا۔ کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ انگریز کمانڈر انچیف میسروی صاحب نے ایسا کرنے سے انہیں روکا۔ حالانکہ میسیری ان دنوں چھٹی پر تھے اور ان کی جگہ گریسی صاحب کمانڈر انچیف تھے۔ ایک اور صاحب نے لکھا ہے کہ سپریم کمانڈر آکن لک صاحب نے معاملہ ٹال دیا تھا، اور دیر کروانے کے لئے لاہور ہوائی جہاز پر دلی سے تشریف لائے تھے۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ اگر اس وقت جرأت سے کام لیا جاتا جموں دوسری نگر میں فوجیں نہ بھیج دی جاتیں تو نہ لڑائی ہوتی اور ریاست کشمیر کا جھگڑا ختم ہو چکا تھا اس کے باوجود بھی ہمارے پاس ریاست جوناگڈھ پر ہندوستان کا حملہ کرنا تھا موجود تھا۔ بعد کے حالات سے اس امر کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اب تاریخی چکر کے بیچ میں ریاست کشمیر کی قسمت لٹک گئی ہے۔ خدا جانے اس ریاست کے عوام الناس کو کب چین کی زندگی نصیب ہو گی۔

اس جنگی ماحول میں اپنے بچوں کی کوئی خبر گیری کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کی سرحدوں پر میں آزاد فوجوں کو ہتھیار پہنچانے میں مصروف تھا۔ ایسی حالت میں انسان ذاتی معاملات کے متعلق بہت کم سوچ سکتا ہے۔ میری بیوی کو سری نگر سے آ کر بھی آرام نصیب نہ ہوا۔ دن کے وقت جنگل میں رہنا پڑتا تھا کیونکہ ڈوگرہ فوج گاؤں گاؤں چکر لگاتی تھی اور لوگوں کو تکالیف دیتی تھی۔ گھر جلاتی پھرتی تھی۔ میری والدہ اور باقی عزیزوں اور بچوں کو کئی دن اور راتیں جنگلوں میں گزارنا پڑیں۔ انہی حالات میں میرا دوسرا بچہ خالد پیدا ہوا۔ جب میں جنوری ۱۹۴۸ء میں گھر واپس گیا تو مجھے خالد کو دیکھنا

ملا۔ جب چھوٹا تھا تو خالد کی شکل اتنی اچھی نہ تھی۔ مگر پانچ چھ ماہ کا ہوا تو اسکی شکل بہت ہی پیاری ہو گئی تھی اور آج سب بچوں میں میرے خالد کی صورت سب سے پیاری ہے۔

بارہ مولا سے ہٹ کر ہماری فوجیں بھراوڑی سے اس طرف چناری کے پاس جم گئیں۔ اور آج تک یہیں موجود ہیں، البتہ ۱۹۴۸ء میں ریاست کے دو تہائی رقبہ میں سے ہم سے بہت سا رقبہ چھن گیا۔ لداخ یعنی زوجیلہ سے سکردو تک کا رقبہ ہم سے چھن گیا۔ اس علاقہ کے لڑنے والوں نے نہایت ہی مشکل حالات میں دشمنوں کی فوج کا مقابلہ کیا۔ ان مجاہدوں کے لئے کوئی سامان پہنچانے کا کسی قسم کا بندوبست تھا ہی نہیں، ہتھیار اور ایمونیشن بھی ان کے پاس بہت تھوڑا تھا، ادھر سے ہندوستان کی فوج پوری ہتھیاروں سے لیس آگے بڑھ رہی تھی۔ ہندوستانی فوج کے پیچھے باقاعدہ سپلائی کا مکمل انتظام تھا۔ اس کے علاوہ ان ہندوستانی فوجوں کو ہوائی جہازوں کی مکمل امداد حاصل تھی۔ ان حالات میں ہمارے مجاہدوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ایک شاندار بہادری اور جرأت کی دردناک تاریخ تھی۔

بھارت کی مایوسی

دسمبر کے مہینہ میں ہندوستان کو یہ علم ہو گیا کہ ریاست کشمیر میں فیصلہ کن مرحلہ پر جنگ جلدی سے نہیں پہنچائی جا سکتی۔ ایسی سرزمین ہے جہاں لڑائی برسوں تک جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس سرزمین کے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں گوریلا جنگ کے لئے بہترین ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ شیخ عبداللہ جیسے لیڈروں نے ہندوستان کا ساتھ دیا۔ پھر بھی ہندوستان ساری ریاست آزاد فوج کے سپاہیوں سے خالی نہ کروا سکا۔ ہندوستان نے جنگ کی تمام تر ذمہ داری حکومت پاکستان پر ڈالی اور کہا کہ پاکستان سے آزاد فوجوں کو امداد آ رہی

ہے۔ اس لئے پاکستان ریاست کشمیر پر حملے کا ذمہ دار ہے۔ اب بھی پاکستان ریاست میں آزاد کشمیر کی فوجوں کی پوری پشت پناہی کرتا ہے۔ اس لئے سلامتی کونسل کے سامنے ہندوستان نے یہ معاملہ رکھا کہ پاکستان کو حملہ آور قرار دیا جائے، اور اسے کہا جائے کہ ریاست کشمیر میں آزاد فوجوں کی امداد سے دستبردار ہو جائے۔

ان الزامات کے علاوہ اور بھی الزامات تھے جن کی تفصیل میں جانا بے سود ہے۔ جنوری کی ابتداء میں، میں اور میری حکومت کے دفاتر اور وزراء پلندری میں سردیوں کے لئے ڈیرے جما چکے ہوئے تھے۔ سڑکوں کی تعمیر، راشن کی سپلائی، فوجوں کی بھرتی، سول نظام کی دیکھ بھال ہمارے سپرد تھی۔ چونکہ ہندوستانی ہوائی جہاز بمباری کے لئے روزانہ ہی پہنچ جاتے تھے، اس لئے ہم نے اپنے خیمے جنگلوں میں گاڑ دیئے تاکہ ہوائی حملوں سے قدرتی طور پر بچے رہیں۔ چھوٹے چھوٹے دفاتر کے کلرکوں کے لئے ہمارے پاس رہنے کی جگہ نہ تھی۔ پلندری محض ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں پہلے صرف تحصیل کا صدر مقام تھا۔ جہاں اب ساری ریاست کی حکومت ترتیب دی جا رہی تھی۔ اس دور میں چھوٹے چھوٹے کلرکوں نے بڑی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا۔ بے بہا تکالیف کو برداشت کیا۔ ساری قوم جہاد کا خیال اور تصورات لیے کام کر رہی تھی۔ چاہے وہ خچر کے چلانے والا مزدور ہو یا وہ آزاد حکومت کا ایک کلرک ہو، یا وہ گاؤں کا ایک پٹواری ہو۔ یہ سب اپنے آپ کو جہاد کی صفوں میں سمجھتے تھے جو بڑی اچھی سپرٹ تھی۔ ایسے ہی دور میں کسی کے صحیح کام اور کردار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

امن کے زمانہ میں لیڈر ساون بھادوں کے مینڈکوں کی طرح پیدا ہو جاتے ہیں

اپنی دھواں دار تقاریر سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ ان تقاریر میں جو خیالی پل باندھتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ جب آزاد کشمیر کے محاذوں پر جنگ ختم ہو گئی ۱۹۴۹ء سے لے کر آج تک سیاست کے میدان میں کیا کیا گل کھلائے گئے۔ اس کی گھناؤنی تفصیل دہرانے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

ساری دنیا ان مجاہدوں کے ساتھ ہمدردی رکھتی تھی۔ پاکستان کے عوام میں ان لوگوں کے لئے اتھاہ سمندر کی گہرائی جتنے پیارے جذبات تھے۔ خود ہزاروں پاکستانی نوجوان اس جہاد میں والنٹیئر ہو کر آئے اور انہوں نے اپنے اپنے طریق سے قربانیاں دیں اور کام بھی کیا۔ اور اپنے ملک کی محبت کی کسوٹی پر یہ قربانیاں نہایت اچھے اور بلند جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔

جذبۂ جہاد

اسی پلندری کے مقام پر لائل پور زمیندارہ کالج کا ایک نوجوان بھی شہید ہو گیا۔ جس نے اپنے کالج کی تعلیم کو خیرباد کہا اور اپنے والد کو پوچھے بغیر اس جہاد کے خیال سے چل پڑا جب پلندری پہنچا تو ابھی اپنے کالج کے سفید کپڑے پہنے رکھے تھے۔ غریب کو جنگ کا تجربہ ہی کیا تھا؟ فوراً ہوائی جہاز آ گیا۔ بچے نے سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ اس نے پریشانی میں بھاگنا شروع۔ ایک لمحہ میں اس جہاز نے اسے سفید شلوار کی وجہ سے دیکھ لیا، جہاز نے گولیاں برسائیں ان گولیوں سے وہ شہید ہو گیا، گو اس نے لڑائی نہ لڑی، نہ ہی وہ لڑائی لڑ سکتا تھا مگر پاکستان کے عوام الناس کے صحیح اور گہرے جذبے کی مثال اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی معیار پر آپ پاکستانی عوام کا اندازہ لگا لیں کہ پاکستان کے عوام سادہ لوح اور صحیح جذبات رکھنے والے لوگ ہیں۔ جن کی نوے فی صد آبادی گاؤں میں آباد ہے۔ ان لوگوں کو ہم سیاستدانوں نے (میں اس میں اپنے آپ کو برابر کا قصوروار سمجھتا ہوں) اپنے معمولی سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے لئے ہم نے ان سادہ لوح انسانوں کو استعمال کیا

ہم میں سے کوئی نہ تھا۔ جسے ان انمول جذبات کی قدر ہوتی جنکی بنیادوں پر ایک خوبصورت اور عالیشان قوم بن سکتی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد اس ملک میں بلند پایہ کا کوئی لیڈر نہ تھا۔ سب کے ذہن مقامی سیاست تک پہنچ سکتے تھے۔ ان میں وہ ذہن کا معراج تھا ہی نہیں جس کے بل بوتے پر ایک لیڈر ایک قوم کو معراج کی منزلیں تدبر اور سیاست سے طے کرواتا ہے۔

پلندری ۵ جنوری کو شام کے وقت میں نے اپنے وزراء کے علاوہ افسروں کو بلایا ہوا تھا تاکہ عوام کے کچھ مسائل طے ہو سکیں۔ عام لوگ بھی تقریباً پانچ سو جمع ہو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اب چونکہ اندھیرا ہو جائے گا لہذا ہوائی جہاز کے آنے کا کوئی خدشہ بھی قطعاً نہ تھا۔ بلکہ ہم سب خاصی لاپرواہی سے بیٹھے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھے کہ ایک جہاز فوراً ہمارے اوپر آگیا۔ پلندری کے عقب میں ایک خاصا اونچا پہاڑ ہے اس پہاڑ کی اوٹ سے فوراً ایک جہاز آنکلا جو جموں ہوائی اڈے سے اڑ کر اوڑی گیا تھا اور واپسی پر اس راستہ سے گزر رہا تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا، اس جہاز نے بے دردی سے ہم پر گولیاں تیزی سے برسانی شروع کر دیں۔ فوراً ہم لوگوں نے کچے مکانوں میں پناہ لی مگر جہاز نے چکر کاٹ کاٹ کر گولیاں برسانی شروع کیں جو دیواروں کو پھاڑ کر اندر آ رہی تھیں۔ اس لمحے لوگوں نے میری جان بچانے کے لئے میرے گرد بیس تیس آدمیوں کی چھتری بنا دی اور گولیوں سے جو پتھر آگے پیچھے اڑتے تھے۔ ان سے بہت سے آدمی زخمی ہو گئے۔ جب جہاز کے پاس گولیاں ختم ہوئیں تو ہماری جان چھوٹی۔

سلامتی کونسل میں

دوسرے دن میں اگلے علاقہ میں دورہ پر چلا گیا۔ جنوری کی ۱۳ تاریخ کو مجھے اس علاقہ میں ہی خبر آئی کہ راولپنڈی میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے مجھے بلاوا ہے۔ چنانچہ میں پہلے پیدل چل کر سون (پاکستان کا ایک مقام ہے) میں پہنچا یہ فاصلہ کوئی ۸۰ میل

کے لگ بھگ ہوگا۔ سون سے جیپ پر راولپنڈی پہنچا۔ اسی رات راولپنڈی سے کراچی آگیا۔ کراچی سے پاسپورٹ آفس کے لوازمات سے فارغ ہو کر میں نیویارک روانہ ہوا۔ ۱۷، ۱۸ جنوری کو میں نیویارک میں سلامتی کونسل کی میٹنگ کے لئے موجود تھا۔ اس سفر سے جو کوفت مجھے ہوئی اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر میرے سیکرٹری کی حیثیت سے میرے ساتھ تھے۔

نیویارک پہنچے تو ہماری خبر اخباروں میں آگئی۔ مگر تصویر میری آنے کی بجائے ڈاکٹر تاثیر کی آگئی۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب قراقلی کی ایک عجیب قسم کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شکل بھی تو خاصی ہیبت ناک ہوا کرتی تھی۔ ہندوستان نے آزاد کشمیر کی فوجوں کو بڑے بدنام ناموں سے پکارا تھا اور نیویارک کے پریس میں آزاد کشمیر کی جنگ کو ایک ظالم حملہ آوروں کی شکل میں پیش کیا ہوا تھا۔ پریس والوں نے خیال کیا ہوگا کہ ایسے لوگوں کا لیڈر کوئی ہیبت ناک ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے تصویر تو ہیرلڈ ٹریبیون میں تاثیر صاحب کی باقاعدہ چھپی اور نیچے میرا نام تھا۔ دوسرے دن ہم نے تردید کروائی مگر تردید کرتے وقت نیویارک کے اخبار تردید کو کسی ایسی جگہ چھاپتے ہیں کہ اگر چراغ لیکر بھی ڈھونڈا جائے تو مشکل سے نظر آسکتی ہے۔ سو تردید بے معنی ہو گئی۔

وہاں دوسرے یا تیسرے ہی دن ہم نے اپنی پریس کانفرنس بلائی۔ اُدھر شیخ عبداللہ کو گوپالا سوامی آئنگر ساتھ ساتھ لیے پھرتے۔ ایک لمحہ کے لئے شیخ عبداللہ کا دامن وہ نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ عبداللہ پر اس وقت بھی ان لوگوں کو اعتماد نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ انہیں سیلون میں بھی کھڑا ہونے نہیں دیتے تھے۔

اس قدر تنگ دلی اور بد اعتمادی کا مظاہرہ بھی کسی حکومت کو نہیں کرنا چاہیے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انجام کار شیخ عبداللہ ان کے پنجہ سے نکل گئے اور جیل میں ٹھونس دیے گئے۔ ہندوستان کے لئے شیخ عبداللہ کی جیل سب سے بڑی بدنامی ہے۔ اس مرحلہ پر شیخ عبداللہ نے

عوام کی صحیح ترجمانی کی ہے اور ذاتی طور پر قربانی دی ہے۔ جس کا احساس پاکستان کے عوام کو اچھی طرح ہے۔ جب شیخ صاحب رہا ہو کر ۱۹۶۴ء میں پاکستان آئے تو ان کی مخلصانہ طور پر عزت کی گئی۔

پریس کانفرنس میں ایک سو کے لگ بھگ لوگ تشریف لے آئے۔ یہ میری پہلی بین الاقوامی پریس کانفرنس تھی۔ اس وقت چونکہ سر ظفر اللہ خان نے فلسطین کے مسلمانوں کی حمایت کی تھی۔ اس لئے نیویارک کا پریس پاکستان کے خلاف تھا کیونکہ نیویارک کے پریس میں یہودی لوگوں کا سرمایہ ہے جو سب فلسطین میں یہودیوں کی کھلی حمایت کرتے تھے اس لئے پریس کے نمائندے پاکستان کی ہر معاملہ میں مخالفت پر تلے رہتے تھے۔ مجھ سے ان پریس والوں نے ناجائز قسم کے بھی کئی سوالات کئے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ میں محض پاکستان کا ایک ایجنٹ ہوں، پاسپورٹ وغیرہ بھی پاکستان نے دیا ہے۔ ہمارے مقاصد کی کوئی اصولی بنا پر مخالفت نہ تھی۔ میں نے مسئلہ کشمیر کا نقشہ سامنے رکھ کر آہستہ آہستہ ایک وکیل کی حیثیت سے انہیں سمجھایا۔ پھر ہری سنگھ کی برسوں کے مظالم کی داستان مختصر الفاظ میں بتائی اور بغاوت کی وجوہات بیان کیں میں نے انہیں سمجھایا کہ ہندوستان سے ہماری مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ اس جابر حکومت نے جس کے خلاف ہم نے بغاوت کی ہے اس نے نہرو کو بھی جیل میں ڈالا تھا۔ وغیرہ۔

پیچھے سے ایک پریس والی عورت نے مجھے کان میں جھک کر کہا کہ تمہاری تقریر بہت اچھی جا رہی ہے ہمت کرو! ابتدا میں پسینہ ضرور آیا مگر انجام کار میں اپنا مطلب انہیں سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ میری پریس کانفرنس دنیا کے اخبارات میں چھاپی گئی۔

اگر میں ذاتی حملوں کی وجہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتا تو میری شکست یقینی تھی۔ ایک بڑے مقصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال غالب تھا جسکا مجھے شدید احساس

تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد اس کی ساری تفصیل چودھری ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی صاحب تک پہنچی تو وہ خوش ہوئے۔ مجھے مبارکباد دی۔ چودھری ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی صاحب پاکستانی وفد کے بڑے ممبر تھے۔ چودھری ظفر اللہ خان اس وقت وزیر خارجہ پاکستان تھے اور اس وفد کے سربراہ بھی تھے۔

سلامتی کونسل میں بحث شروع ہوئی۔ شیخ عبداللہ نے تقریر کی۔ دوسرے دن اتوار تھا، اور سوموار کو ظفر اللہ خان کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ مجھے بھی تقریر کا موقعہ مل جائے۔ میں نے ڈاکٹر تاثیر صاحب مرحوم سے کہا کہ ساری تقریر کے نکات سر ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی صاحب (جو سیکرٹری جنرل تھے) سے سمجھ کر ایک تقریر کی صورت میں لکھیں۔ پھر میں اسے اپنے مطلب کے لئے تیار کر لونگا۔ جب اتوار کی شام ہوئی تو ڈاکٹر تاثیر صاحب وہاں سے غائب تھے۔ ان کا مجھے کوئی علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ بہرحال میں نے اپنی تقریر خود لکھی۔ اسے شیشے کے سامنے بغیر کاغذ کی امداد کے دوبارہ ادا کیا۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ تقریر ٹھیک ہو جائے گی۔ تقریر کے واقعاتی پہلو پر میں بخوبی حاوی تھا۔ اخلاقی طور پر ہمارا کیس ہندوستان کے کیس سے زیادہ مضبوط تھا۔ انگریزی زبان پر مجھے عبور حاصل تھا۔ پھر سلامتی کونسل میں تقریریں سن بھی لی تھیں، اس لئے اعتماد تھا کہ پوری تسلی سے تقریر کروں گا۔

ڈاکٹر تاثیر صبح کمرے میں آئے اور سخت پریشان ہوئے۔ میں نے ان سے اظہار غصہ کیا ابھی یہی بات ہو رہی تھی کہ ایک تیسرے صاحب یہ خبر لے کر آئے کہ مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ پھر سلامتی کونسل میں ہم سب گئے مگر اس دن سلامتی کونسل میں مہاتما گاندھی پر تقاریر ہوئیں۔ اور ایک ماہ کے لئے سلامتی کونسل برخواست ہوگئی۔ مہاتما گاندھی ایک پستول

کی گولی سے مارے گئے تھے۔ ان کی موت پر تاثیر صاحب کو اور مجھے سخت صدمہ ہوا۔
ڈاکٹر صاحب اور میں نے واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس دوران
میں نیویارک دیکھنے کا مجھے کوئی موقعہ ہی نہ ملا۔ ہندوستان کے اخباروں نے
میرے متعلق لکھا کہ میں نے نیویارک میں ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ اس کی
تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ ہندوستان کے اخباروں کا کہنا تھا کہ یہ مواد کراچی کی کسی فائل
سے انہیں ملا تھا۔ جو کسی نے چرا کر ہندوستان کو دے دی تھی۔ ایسی باتوں پر انسان کسطرح
یقین کر سکتا ہے۔ سچ کہا گیا ہے کہ جنگ میں سچائی کی سب سے پہلے قربانی کی جاتی
ہے۔ ڈاکٹر تاثیر (جو میرے استاد بھی تھے) لاہور کالج میں چلے گئے اور ۱۹۵۱ء میں
اچانک فوت ہو گئے۔ ان کا کشمیر کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ کشمیر میں ان کے کئی دوست
تھے۔ میں لاہور کے اسلامیہ کالج میں ان کا شاگرد رہا تھا۔ مگر بہت معمولی عرصہ کے لئے۔
کیونکہ وہ بعد میں خود ولایت تعلیم کے لئے چلے گئے تھے۔ البتہ قاضی ظہیر الدین جو میرے
فارسی اور دینیات کے استاد رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ۱۹۵۰ء تک رہے جب کہ
میری حکومت بے ضابطہ طریقہ سے اور ایک سازش کے تحت توڑ دی گئی۔ انہیں میری
وجہ سے بڑی تکالیف اٹھانا پڑیں اور انجام کار آزاد کشمیر سے مایوس ہو کر واپس لاہور
چلے گئے۔

پراگندہ تخریبی دور کا آغاز

جب میں سلامتی کونسل سے واپس لاہور پہنچا تو میرے خلاف سازشیں شروع
ہو چکی تھیں۔ جہاد کرنے والے تو محاذوں پر لڑ رہے تھے مگر سیاستدانوں اور لیڈروں نے

محض شہرت اور عزت کی وجہ سے میرے خلاف گہری سازشیں سیالکوٹ اور راولپنڈی میں شروع کر دیں۔ آزاد کشمیر کی سیاست میں نہایت ہی تخریبی دور کا آغاز ہوا۔ جو ابھی تک جاری ہے۔

میری حکومت کا اعلان ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا۔ بعد میں میں نے اپنے وزیر بھی چن لئے تھے۔ مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی مکمل تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ اس وقت مسلم کانفرنس کے صدر چودھری حمید اللہ مرحوم تھے۔ سارے کے سارے وزیر مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ مسلم کانفرنس ہی مسلمانوں کی ترجمانی کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے آئینی طور پر ہر معاملہ کو درست رکھنے اور صحیح طور پر چلانے کی کوشش کی۔ ایسے انقلابات کے دوران جبکہ ہزاروں انسان محاذ جنگ پر برسرپیکار ہوں۔ معمولی قسم کی پابندیوں سے انسان خود کو آزاد نہ کرے تو حکومت کا انتظام چلانا یا چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ میں نے حتی الوسع یہ بھی کوشش جاری رکھی کہ جو مہاجرین جموں و کشمیر سے بے خانماں ہو کر آئے تھے۔ پاکستان میں ان کی دیکھ بھال ہو اور یقیناً پاکستان میں ان لوگوں کی خاطر خواہ دیکھ بھال ہوئی اگرچہ انہیں وہ زندگی واپس نہ مل سکتی تھی، جو برسوں میں انہیں نصیب ہوئی تھی۔ ہندوستان سے آنے والے ایک کروڑ مہاجرین کی بھی یہی حالت تھی۔ سارا پاکستان ایسے دور سے گزر رہا تھا۔ اس لئے کسی کے خلاف شکایت بے معنی ہے۔ اسی طرح مہاجر لیڈر جو پاکستان میں آئے ان کی میں نے حتی الامکان مدد کی۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرے دوست تھے۔ بلکہ اس خاطر کہ حکومت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے مجھ پر فرض عائد ہوتا تھا۔

باد مخالف اور میں !

حقیقتاً جس وجہ سے میری مخالفت سیاسی طور پر شروع ہوئی۔ وہ میری بین الاقوامی شہرت تھی۔ ۲۴، اکتوبر سے ۲۵، اکتوبر تک میرا نام دنیا بھر کے اخباروں میں چھپ گیا اور یہ صرف کوئی قابلیت نہیں تھی۔ یا کسی کوشش کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ یہ محض اس مسئلے کی اہمیت کی وجہ سے میری شخصیت بنتی گئی۔ اگرچہ میں اپنے سیاست دانوں میں عمر بھی اور تجربہ میں بھی چھوٹا تھا مگر میری قسمت بلند تھی۔ اس بلندی قسمت کا مقابلہ نہ میرے مخالف کر سکے اور نہ ہی قسمت کی بلندی کو نیچے لا سکے۔ میں نے بہر حال خدا کا شکر کیا کہ جس نے مجھے ایک لمحہ میں دنیا کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ محض خدا کی ہی دین ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ میں ضرور نہایت ہی انکسار سے کہوں گا کہ جب بڑائی کا تاج مجھ پر حالات نے رکھ دیا، تو پھر میں نے اسے سنبھالے رکھا، جو بھی طاقتیں میں بروئے کار لا سکا، اپنی پوزیشن بحال رکھنے کے لئے لاتا رہا۔ میں اپنی شہرتِ کارکردگی کو مزید بڑھاتا گیا اور اتنی بڑھتی گئی کہ پاکستان کے سیاست دان بھی میرے مخالف ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ میری عمر بڑی چھوٹی تھی مگر اس عمر میں ایک تحریک کا ہیرو بن گیا، جو تحریک پاکستان کے عوام میں بدرجہ اتم مقبول ہو چکی تھی۔ یہ ایسے واقعات تھے جن میں مجھے بہت کم دخل تھا، اور ان کے بنانے میں میرا بہت ہی کم حصہ تھا۔

جب یہ صدارت کا مسئلہ شروع ہوا تھا، تو اس وقت یہ ایک خطرناک کھیل دکھائی دے رہا تھا اور ریاست کے بڑے بڑے لیڈر (جن کا تعارف پاکستان

میں پہلے سے تھا) انھوں نے یہ خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا تھا اور وجہ یہ بتائی تھی کہ ان کے بال بچے ابھی ڈوگروں کے چنگل میں ہیں۔ مگر میرے بال بچے بھی تو ڈوگروں کے نرغے میں تھے۔ میں نے ایک صحیح موقعہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا جبکہ وہ دوسرے کنارے پر کھڑے سوچتے رہے۔ تاریخ اسی طرح اپنے کھیل کھیلتی ہے۔ لہٰذا بعد میں میری مخالفت محض مخالفت کی وجہ سے کی گئی ہیں ان بزرگوں کا نام لینا اس لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ اس طرح سے ان کے دل دکھیں گے۔ وہ خود جانتے ہیں۔ دراصل اس نازک دور میں ہمارے کئی لیڈر یہ خیال کرتے تھے کہ یہ سارا معاملہ چند دنوں میں ختم ہو جائے گا اور جس برات کا دولہا میں بنا تھا، وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گی اور یہ بھی ان بزرگوں کو دکھائی دے رہا تھا کہ شاید یہ دولہا پھانسی کی رسی کی طرف جا رہا ہے۔ اس وقت انھوں نے بھی یہی سوچا ہو گا کہ ہماری بلا سے اگر جاتا ہے تو جائے یہ وہ پس منظر تھا جب کہ ایک آزاد جموں وکشمیر کی حکومت کا اعلان ریڈیو پاکستان سے پہلی بار کیا گیا۔ دنیا میں یہ اعلان چوبیس گھنٹے میں پھیل گیا اور اس کے ساتھ میرا نام منسلک ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں کشمیر کے مختلف محاذوں پر پورے جوش کے ساتھ جنگ جاری رہی تھی۔ قبائلیوں نے ہماری پوری امداد کی۔ سرحد کی ریاستوں نے جن میں سوات اور دیر شامل ہیں ابھی آزادی کشمیر کی تحریک کی امداد کی اور جہاد میں پورے جذبے کے ساتھ حصہ لیا۔ ان لوگوں میں سے سینکڑوں میدان جنگ میں کام آئے۔ ۱۹۴۸ء کے پورے سال میں ہندوستان کی فوجوں نے ریاست

میں مکمل تیاری جاری رکھی۔ ہندوستان سے فوج اور سامان کشمیر میں پہنچایا گیا۔ اس کے مقابلہ میں ہماری جانب کوئی تیاری کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہمارے پاس ذرائع ہی کون سے تھے، جو صاحب اقتدار ہماری کچھ امداد کر سکتے تھے۔ انہوں نے نہ کی۔ اس معاملہ میں قائداعظم کا اپنی کابینہ سے اختلاف ہوا اور ایک وزیر اپنی فائل قائداعظم کے سامنے پھینک کر چلے گئے۔ بعد میں خاص طور پر انہیں منایا گیا۔

اس تیاری کے بعد ہندوستان نے رو جیلہ۔ راجوری اور مینڈر کے محاذوں پر حملہ کر کے ہمیں پسپا کیا اور مزید دو لاکھ کے لگ بھگ مہاجرین پاکستان میں آوارد ہوئے۔ پاکستان اپنے حالات اور بین الاقوامی مجبوریوں کی وجہ سے ہمیں امداد نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ بین الاقوامی جنگ کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ کم از کم جب بھی میں کراچی امداد کے لئے حاضر ہوا مجھے یہی بتایا گیا۔ کئی بار میں مایوس ہو کر خون کے آنسو روتا ہوا واپس تراڑکھل آیا۔ یہ ایسی دردناک کہانی ہے جسے بیان کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔ اس کی بھی مصلحت ہے۔ صرف تاریخ دان ایسے معاملے سے نبٹ سکتا ہے اور میں تاریخ دان نہیں ہو سکتا کیونکہ میری ذات اس میں فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔

یو۔ این۔ او کمیشن

اسی عرصہ میں سلامتی کونسل کی جانب سے ایک کمیشن ہندوستان اور پاکستان پہنچ چکا تھا۔ ہندوستان نے اب بیشتر ریاستی حصہ پر قدم جما دیے تھے۔ اس کمیشن کی کوششوں سے ۱۹۴۹ء کے شروع میں ریاست کشمیر میں جنگ بند ہوگئی اگر ہمارے پاس ہتھیار ہوتے اور پاکستان کی فوج بھی امداد کے لئے تیار ہو جاتی تو یقیناً ہمیں جنگ بندی پر رضامند

نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر حالات اس کے برعکس تھے اگر ایک ماہ اور جنگ رہتی تو آزاد کشمیر ریاست کا حصہ جواب ہے پاس ہے جونا گڑھ اور حیدر آباد کی طرح ہمارے ہاتھوں سے ہندوستان کے پاس چلا جاتا۔ پھر کشمیر میں محض بات چیت کے لئے بھی ہماری کوئی حیثیت نہیں رہتی اور جس طرح کہ جونا گڑھ اور حیدر آباد میں واقعات رونما ہوئے تھے یہ واقعات بھی اُسی قدر دردناک صورت اختیار کر لیتے۔ اب کم از کم ایک حصہ ریاست کا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ معاملہ سلامتی کونسل میں بھی ابھی تک موجود ہے اور وقت آنے پر جنگ یا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ کشمیر کے عوام کو یہ حق دیدیا جائے کہ وہ ریاست میں اپنی مرضی کا فیصلہ صادر کریں۔ دنیا کے حالات ایک نہج پر نہیں رہتے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کی پوزیشن بیرونی اور اندرونی بھی ایک نہج پر نہیں رہ سکتی۔ نہ ہی پاکستان کی سیاسی حالت ایک نہج پر رہے گی بلکہ حالات صحیح ہونے پر معاملات ہندوستان سے مناسب طریقوں سے نپٹائے جا سکتے ہیں۔ خود ہندوستان میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ اور ایسے خیالات کی بھی تخلیق ہو رہی ہے کہ کشمیر کے صحیح اور دانشمندانہ حل کے لئے سازگار ہوں گے۔ جو لوگ قربانیاں دے رہے ہیں ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ آخر کشمیر کے غریب عوام الناس نے وہ کونسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں وہ ایک لا انتہاہی جہنم میں جھونک دیے جائیں۔

آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم کرنے کا مسئلہ

سلامتی کونسل کا کمیشن برائے ہند و پاکستان اپنی کاروائی میں پوری تندہی کے

ساتھ مصروف ہو گیا۔ ان لوگوں کی نیک نیتی پر شک یا شبہ کرنا زیادتی ہو گی۔ انہوں نے مخلصانہ کوشش کی۔ کم از کم ایک قسم کا ماحول پیدا کیا جس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان اور پاکستان ایک صحیح قسم کے تصفیہ پر متفق ہو سکتے تھے۔ مگر یہ کمیشن کامیابی کے نزدیک پہنچ کر رہ گیا۔ اگر ریاست میں رائے شماری کروانے میں یہ کامیاب ہو جاتا تو اقوام متحدہ کی تنظیم کے لئے یہ بہت کار آمد بات ہوتی۔ اس کمیشن نے ریاست کے دونوں حصوں میں انتظامیہ کے معاملات کو بڑی گہری نظر سے دیکھا۔ مظفر آباد میں جب کہ آزاد حکومت خیمے میں ہی کام کر رہی تھی تو ہم لوگوں نے ان سے تبادلہ خیالات کیا۔ بڑے خوش ہوئے اگرچہ ان کی وہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی جو کہ آزاد حکومت کے لئے حق میں تھی۔ تاہم کمیشن نے آزاد حکومت کی اس حیثیت کو تسلیم کیا کہ اس علاقہ میں انتظام حکومت مکمل طور پر چل رہا ہے۔ قانونی طور پر ان لوگوں کو اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ آزاد حکومت کی حیثیت تسلیم کروا سکیں۔ اگر حکومت پاکستان زور دیتی تو یہ بھی ہو سکتا تھا۔ حکومت پاکستان خود اس معاملہ میں پس و پیش کرتی رہی۔ اس کی وجوہات مجھے کبھی نہیں بتائی گئیں بلکہ اس معاملہ کو پردۂ راز میں رکھا گیا۔

سلامتی کونسل کے وفود کئی بار آئے اور گئے، اور نمائندے بھی آئے اور چکر کاٹ کر چلے گئے۔ ہندوستان مضبوط ہوتا گیا مگر پاکستان میں سیاسی حالات بدتر ہوتے گئے ان سیاسی حالات نے متواتر مسئلہ کشمیر پر اثر ڈالا۔ اس مسئلہ کی اخلاقی حیثیت بھی اس وجہ سے کمزور ہوتی گئی۔ پاکستان میں سیاسی بحران کی وجہ سے پاکستان کی حالت خود کمزور ہوتی گئی۔ بیرونی ملکوں میں پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ ہندوستان متواتر بیرونی ملکوں میں پاکستان کو بری طرح بدنام کرتا گیا اور اب بھی کرتا ہے۔ ادھر افغانستان نے

بھی ابتدا سے پاکستان کی مخالفت شروع کی۔ البتہ ترکی اور ایران میں کچھ حیثیت قائم رہی۔ امریکہ نے بھی پاکستان کا ساتھ سیاسی بحران کے باوجود دیا اور امریکہ نے جو ہتھیاروں کی امداد پاکستان کو دینی شروع کی تو پھر سے پاکستان کی حیثیت بحال ہوتی گئی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پاکستان میں نہایت ہی خطرناک حالات رونما ہو جاتے۔ جس سے اس ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ رہی تھی۔ میرا موضوع پاکستان کی اندرونی سیاست میں دخل دینا نہیں ہو سکتا مگر جہاں تک کہ اندرونی سیاست پاکستان مسئلہ کشمیر پر اثر انداز ہوئی اس پر کچھ کہہ دینا حرج بھی نہیں سمجھتا۔

جوں جوں پاکستان میں سیاسی بحران بڑھتا گیا۔ اس کا اثر آزاد کشمیر کی سیاست پر بھی پڑتا گیا مگر موجودہ انقلاب کے بعد حالات سدھرتے دکھائی دے رہے ہیں اور ابتدا اچھی ہوئی ہے مگر مجھے ابھی بھی ڈر اس بات کا ہے کہ عوام الناس بالکل بے حس ہو چکے ہیں۔ ملکی معاملات میں عوام الناس اس قسم کی دلچسپی نہیں لیتے جس طرح کہ پاکستان کی تحریک میں لی گئی تھی۔ یا پھر کشمیر کی جنگ کے سلسلہ میں پاکستان نے اپنی زندگی کا ثبوت دیا تھا۔ اللہ کرے حالات پھر ایسے پیدا ہو جائیں جن سے عوام الناس میں صحیح قسم کی سیاسی بیداری کے جذبات پیدا ہوں اور پاکستان کے عوام ایک جذبہ رکھنے والی اور آزادی کی خاطر لڑنے والی قوم صحیح معنوں میں بن جائے۔

تخریبی حربے

۱۹۴۹ء میں جب جنگ ختم کر دی گئی تو امن کے دوران میں میرے خلاف سازشیں اور بڑھتی گئیں۔ مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی آڑ لے کر میرے خلاف

ایک سیاسی بحران پیدا کیا گیا۔ جہاں جہاں مہاجرین تھے ان کے کیمپوں میں سے جعلی قسم کے زیر ریزولیوشن اور گمنام خطوط وزیر اعظم پاکستان کو بھیجنے جانے لگے۔ میں حکومت کے کاموں میں مصروف تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ کے لئے میرے پاس کوئی وقت نہ تھا لہٰذا میرے مخالفین اس سازش میں کامیاب ہوئے۔ چونکہ پاکستان میں میری حیثیت (سیاسی طور پر اور آزاد کشمیر کی تحریک کا بانی ہونے کی حیثیت سے) بڑی مضبوط ہو چکی تھی۔ لہٰذا حکومت پاکستان نے مجھے برداشت ہی کیا۔ اگرچہ میری مخالفت بھی مظفرآباد سے کراچی تک جاری رہی۔

۱۹۴۹ء میں مارچ کے مہینے میں میری دوبارہ حکومت بنائی گئی جس میں نئے وزیر لئے گئے تاکہ مخالف گروپ کی بھی تسلی ہو سکے۔ مگر اس سے حالات اور خراب ہونے لگے۔ کیونکہ حکومت میں جو ایک جہتی تھی وہ سازشوں کی نذر ہو گئی۔ افسرانِ حکومت پریشان ہو گئے کہ آخر کس کا حکم مانیں۔ موجودہ حکومت کا ——— یا آنے والی حکومت کا! اور نظام حکومت آزاد علاقہ میں بد سے بدتر حالات کا سامنا کرنے لگا۔

بالآخر یہ سوچا گیا کہ جب تک میں یہاں موجود ہوں میرے خلاف سکیم کامیاب نہ ہو سکے گی لہٰذا مرکزی حکومت سے یہ منظور کرا لیا گیا کہ مجھے امریکہ اور ولایت وغیرہ کے طویل دورہ پر بھیج دیا جائے اور بعد میں میرے حالات اور پوزیشن کو کھوکھلا کر دیا جائے تاکہ واپسی پر میں خود بخود ہتھیار ڈال دوں۔ مجھے وزیرِ اعظم پاکستان نے باہر کے دورہ پر جانے کا حکم صادر کر دیا۔ سلامتی کونسل میں ہمارا مقدمہ بھی پیش تھا۔ اصل مقصد مقدمے کی پیروی قطعاً نہ تھی بلکہ میری اپنے ملک سے غیر حاضری مقصود تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میرے جانے کے بعد ایک بناوٹی قسم کی کونسل بلائی گئی

جس کے خلاف راولپنڈی شہر میں سخت مظاہرے ہوئے۔ یہ ایک سوچی سمجھی تجویز کے ذریعے ہو رہا تھا لہذا میرا اس کے خلاف احتجاج کیا معنی رکھتا تھا۔

سلامتی کونسل میں دوبارہ میں گیا تو میں نے لندن میں بہت بڑی پریس کانفرنس کی بی بی سی سے تقریر کی، پاکستانی طالب علموں سے خطاب کیا۔ یہ تسلی بخش کام تھا۔ نیو یارک پہنچ کر بھی مجھے پھر جو حکم ہوا اس کے مطابق کام کرتا رہا۔ گورمانی صاحب اس وقت وزیر امور کشمیر تھے۔ وہ بھی سلامتی کونسل میں مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے۔ حالانکہ چودھری محمد علی سیکرٹری کی حیثیت سے وہاں تھے۔ سر ظفر اللہ خاں تو باقاعدہ پیروی کر ہی رہے تھے۔ ہم لوگ کافی تعداد میں وہاں ایک شاندار ہوٹل میں جمع ہو گئے۔ میں واشنگٹن بھی گیا اور وہاں کئی جگہ تقریریں کیں۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ میں نے وہاں کئی قسم کے لوگوں میں تقاریر کیں۔ مگر امریکہ میں کشمیر کے معاملات میں بہت کم لوگ دل چسپی لے سکتے تھے۔ وہاں کے لوگ عموماً اپنے اپنے ذاتی کاموں میں سخت مصروف ہوتے ہیں۔ ایک طالب علموں کی لیگ میں جہاں مجھے پاکستانی سفارت خانے نے بھیجا تھا۔ میں خاصا سفر کر کے ایک شاندار ہوٹل میں پہنچا اور تقریر کے کمرے میں گیا تو تین چار طالب علم جو وسط ایشیا کے معاملات میں خصوصی ٹریننگ حاصل کر رہے تھے۔ وہاں موجود تھے۔ ایسے موقعوں پر خاصی مایوسی ہو جاتی ہے۔ یہ محض اس لئے ہوتا تھا کہ ہماری تنظیم بے حد کمزور سی تھی۔ سفارت خانہ کے اصحاب ایسے معاملوں میں دل چسپی نہ لیتے تھے۔ بہرحال ابھی تک تو امریکہ سے واقفیت ہو ہی رہی تھی۔ ساری ٹیکنیک سے کسی کو صحیح واقفیت نہ تھی۔

میاں مشتاق احمد گورمانی!

گورمانی صاحب اور باقیوں کو وہاں چھوڑ کر مجھے لندن وغیرہ جانے کا حکم مل گیا تھا۔

لندن میں واپسی پر میں نے کئی تقریریں کیں۔ پھر ترکی روانہ ہو گیا۔ ترکی میں میرا شاندار استقبال ہوا۔ ترک ہمارے ساتھ بے حد ہمدردی رکھتے ہیں۔ عربوں سے ترک ہمارے بہترین دوست بن سکتے ہیں۔ عرب لیڈروں کو پاکستان کے ساتھ حسد ہے۔ شاہ فاروق کو پاکستان کا نام تک پسند نہ تھا۔ جب میں قاہرہ میں ٹھہرا ہوا تھا تو مصر کے مفتی اعظم کو ملنے گیا اور میں نے ان سے درخواست کی کہ کشمیر کے مظلوم لوگوں کے حق میں آپ دعا فرمائیں تو کہنے لگے کہ وزارت خارجہ مصر کا اس کے لئے حکم ضروری ہے۔ مجھے بڑی پریشانی اور مایوسی ہوئی۔ کیونکہ آزاد کشمیر کی تحریک کے ابتدائی دور میں مصر کے اخبار نویسوں نے ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ قاہرہ یا اس کے رہنے والوں کو پاکستان کی کسی بھی تحریک سے مخلصانہ ہمدردی نہ تھی۔ مجھے اس سے بے حد مایوسی ہوئی اور وہاں پندرہ یوم کے لگ بھگ قیام کے بعد میں کراچی واپس آگیا۔

کراچی پہنچا تو مجھے وزیراعظم صاحب نے دو ماہ کے لئے وہاں حکماً ٹھہرا دیا۔ مجھے معلوم تو ہو گیا کہ معاملہ کیا ہے لہذا دو ماہ مجبوری طور پر ٹھہرنے کے بعد میں راولپنڈی آگیا۔ گورمانی صاحب بعد میں پہنچے۔ اس کے بعد پھر وزیراعظم لیاقت علی خاں مرحوم امریکہ تشریف لے گئے تو گورمانی صاحب نے مجھے آکر حکم دیا کہ یا ہتھیار

ڈال دوں یا ان کی شرائط پر صدر رہوں۔ میں نے ان کی شرائط پر صدر رہنے سے انکار کر دیا لہٰذا اس کے بعد میری حکومت کے پرخچے اڑا دیے گئے۔ گرمانی صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ حکم حکومت پاکستان کا ہے اور جب وزیر اعظم صاحب واپس آئے تو انہوں نے یہی لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ سب کچھ گورمانی صاحب نے کروایا ہے۔ چودھری ظفر اللہ خاں محض مسکرائے اور بر معنی طور پر خاموش رہے۔ ان کا مطلب میں سمجھ گیا تھا وہ بحیثیت وزیر اعظم کام کر رہے تھے۔ اصل حکم وزیر اعظم لیاقت علی خاں دے کر گئے تھے اس حکم کے صادر ہونے میں زیادہ ہاتھ چودھری محمد علی صاحب کا تھا جو سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے پالیسی وضع کیا کرتے تھے۔

صدائے احتجاج

آزاد کشمیر میں چوبیس گھنٹے کے اندر بغاوت رونما ہو گئی۔ خدا شاہد ہے مجھے اس قدر توقع نہ تھی کہ عوام الناس کو مجھ سے اس قدر عقیدت ہے۔ اس بغاوت کے کرنے والوں کو علم ہے کہ ابتداً میں نے ہرگز ایسے اقدام پر کسی کو تیار نہ کیا تھا نہ ہی میں نے کسی کو کہا کہ ایسی بغاوت کی جائے۔ بعد میں البتہ جب معاملات سخت خرابی پر اتر آئے تو میں نے گرمانی صاحب کے کہنے پر حالات کو سیاسی تحریک کی صورت دی اور بغاوت کی صورت تبدیل ہو گئی۔ جب بھی یو۔ این۔ او کا کوئی وفد وہاں گیا تو آزاد کشمیر میں اس کے سامنے کسی نے اپنی اندرونی شکایت نہ رکھی تھی۔ یہ تحریک سترہ ماہ چل کر اپنی منزل تک پہنچی اور آزاد کشمیر کی سیاست

ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ جب لیاقت علی خاں مرحوم راولپنڈی میں شہید ہوئے وہ آزاد کشمیر کے اس اندرونی معاملہ کو طے کرانے آئے تھے۔ راولپنڈی کا سیاسی جلسہ تو محض برسبیل تذکرہ ہی رکھا گیا تھا مگر وہ شہید ہو گئے۔ اس سے ہم سب سخت پریشان ہوئے۔ حالات سدھر گئے خواجہ ناظم الدین صاحب نے وزارت سنبھال لی اور غلام محمد صاحب جو اس وقت تک سخت علیل تھے گورنر جنرل بن گئے مگر ناظم الدین صاحب کو کبھی وزیر اعظم نہیں بننا چاہیئے تھا۔ یہ ان کے بس کی بات ہرگز نہ تھی ان کی شرافت اور حلیم طبع بھلا سیاست کے ہتھکنڈوں سے کیسے نبھاہ کر سکتی تھی! لوگوں کا خیال ہے کہ شہاب الدین صاحب نے ہی انہیں اس اقدام پر آمادہ کیا۔ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اس معاملے میں زیادہ ہاتھ فضل الرحمٰن صاحب کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کو آگے رکھ کر اصل حکومت کے چلانے میں وہ ہوں گے اب صحیح معاملہ کیا تھا اس پر روشنی خود محترم خواجہ ناظم الدین مرحوم ہی ڈال سکتے تھے۔

پاکستانی سیاست کا معیار

جس طریق پر غلام محمد صاحب نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو فارغ کیا تھا وہ ایک دردناک کہانی ہے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کے ساتھ بڑی سختی کی گئی تھی۔ اس وجہ سے پاکستان کی سیاست کا معیار گرتا گیا۔ مرکزی آئین ساز اسمبلی میں ایسے ایسے سودا بازی کے مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے جن کی تفصیل بیان کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے اس دوران میں جب

محمد علی بوگرہ صاحب وزیر اعظم ہوئے تو میری ان سے کافی واقفیت ہو گئی۔ ان کے کہنے پر میں نے مشرقی پاکستان میں جا کر الیکشن کے دوران تقاریر بھی کیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ایک پارٹی کی جانب سے وہاں چلا گیا۔ گو کہ مسلم لیگ سے مسلم کانفرنس کا بڑا تعلق ہے۔ مگر پھر بھی کشمیر کی سیاست اور حالات کے پیشِ نظر مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک خوشی کی بات ضرور ہے کہ مجھے سارے مشرقی پاکستان کے دورہ کا موقعہ ملا۔ میں نے بڑی واقفیت حاصل کی۔ وہاں کے لوگ غریب مگر سیاسی طور پر بہت آگے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت بہت کم۔ سیاسی بیداری اور سیاسی تنظیم مشرقی پاکستان میں میں نے لاثانی طریقے سے دیکھی۔ وہاں کے لوگ سخت جذباتی ہیں۔ اپنے صوبہ کے لئے گہرا تعصب کا اظہار فوراً کرتے ہیں۔ حال آنکہ اچھے سیاستدان کے لئے ایسا مناسب نہیں ہے میں فضل الحق صاحب مرحوم کے متعلق اچھی رائے نہ بنا سکا ان کے ہتھکنڈے اور قسم کے تھے مگر سہروردی پارٹی کی تنظیم کے ماہر ترین سیاستدانوں میں خیال کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں ڈپلومیسی۔ سیاسی لیڈر شپ اور نظم کے لئے کام کا مادہ سخت موجود تھا۔ یہ شخص ۲۴ گھنٹے کام کر سکتا تھا۔ اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اتنی باتیں بہت کم کسی لیڈر میں اس درجہ پائی جاتی ہیں۔

مرحوم محمد علی بوگرہ صاحب بڑے سادے اور مخلص قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان میں بڑی بُری طرح شکست کھائی۔ کچھ مسلم لیگ وہاں ۵ سال اقتدار میں رہنے کے بعد بڑی بدنام ہو چکی تھی۔ اگر

نورالامین صاحب ہمارے مشورے پر استعفےٰ دے دیتے تو پھر حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ مقامی افسران سب کے سب مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ ان افسران کی وجہ سے بھی مسلم لیگ کی شکست لازمی ہوئی۔ اور مسلم لیگ کی مشرقی پاکستان کی شکست کے بعد مرکز کے حالات بھی بدلتے گئے۔

نہرو۔ بوگرہ اور حبہ خاتون

اس عرصہ میں شیخ عبداللہ صاحب نے نہرو کے خلاف کشمیر میں بغاوت کردی۔ مگر محمد علی بوگرہ صاحب بڑی امیدیں لے کر نہرو کے پاس مصالحت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ لیکن مصالحت کے بجائے نہرو نے غریب شیخ عبداللہ کو راتوں رات گرفتار کروا کر کدّ جیل میں پہنچا دیا۔ سری نگر میں ہندوستانی فوجیوں نے غریب کشمیریوں کے سینے چھلنی کر دیے۔ محمد علی بوگرہ صاحب کو نہرو نے دلّی میں حبہ خاتون کی لمبی لمبی ایسی کہانیاں سنائیں کہ محمد علی صاحب کراچی آکر مجھ سے دورانِ ملاقات دریافت کرنے لگے کہ آخر حبہ خاتون کون ہے؟ مجھے جو مختصر سی حبہ خاتون کی کہانی معلوم تھی ان کے سپرد کردی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ نہرو صاحب نے ہمارے وزیر اعظم صاحب کو کس طرح کہانیاں سنا کر ٹالا ہے۔ ہمارے وزیر اعظم صاحب بھی بڑے بھولے بادشاہ تھے۔

ہمدم دیرینہ

۱۹۵۰ء میں جب مغربی ملکوں کے دورہ کے بعد کراچی سے لاہور پہنچا

تو سلطان مقصود، ایک پرانے دوست بھی راولپنڈی تک سفر کے ساتھی بن گئے ۔ یہ بڑے مخلص دوست ہیں ۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء کے مشکل دنوں میں آزاد کشمیر کی تحریک کی بے حد امداد کی تھی ۔ سلطان مقصود اور میں نے باہمی سازشیں کر کے بندوقیں اور کئی قسم کا سامان آزاد علاقہ میں پہنچایا تاکہ تحریک کی امداد ہو سکے ۔ اس دوست میں بڑی بات میں نے یہ دیکھی کہ بڑا کام کرنے کے بعد بھی کام کی تعریف کے خواہشمند کبھی نہ ہوتے تھے ۔ اگر ان کے کام کی تعریف کی جائے تو جھینپ جاتے تھے ۔ ایک دوست کے مخلص اور صحیح ہونے کی یہ بڑی نشانی ہے ۔

لاہور سے راولپنڈی آتے ہوئے ہم نے خوب گانے گائے اپنی جگہ ہر آدمی گانے کا شوقین ضرور ہے ۔ بروزِ روشن جرأت نہ پڑے تو غسل خانے کے دروازے بند کرنے کے بعد سب ہی لوگ اپنے آپ کو گانا سنا کر خوش ہوتے ہیں ۔ بہرحال مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے یہاں بچی یا بچہ ہونے والا ہے ۔ میرے دو بیٹے جاوید اور خالد موجود تھے اور میری پیاری سی یہ خواہش تھی کہ اب کے بچی ہو جائے ۔ لہٰذا جس دن گھر پہنچا اسی شام کو میرے یہاں بیٹی خدا نے عطا فرمائی ۔ ایسی پیاری بیٹی جسے دیکھ کر میں خوش ہوا ۔ میری خواہش کی اللہ نے تکمیل کر دی میری قسمت دیکھئے کہ ۔ اسی ماہ میری حکومت ٹوٹ گئی ۔ کئی لوگوں نے مجھے کہا کہ اس بیٹی کی قسمت اچھی نہیں کہ اس کے آنے پر حکومت ٹوٹ گئی مگر میں بسا اوقات اپنی جگہ سوچتا رہتا ہوں اور کسی سے کم ہی ذکر کیا ہو گا کہ اگر مجھے اس بیٹی کے عوض دس ایسی حکومتیں سال ہا سال کے لئے ملیں تو یہ سودا کرنے کو تیار کبھی نہ ہوں گا ۔ مجھے اپنی بیٹی جس کا نام میرے دوستوں نے "مہما" رکھا اور پھر بعد میں ہم نے "رفعت ایزد" کیا بہت ہی پیاری ہے ۔ اب اس کا پورا نام

"عفت ہما" ہے۔ جنرل اعظم خان کی فیملی سے میرے بڑے پیارے تعلقات ۱۹۴۷ء
سے ہیں۔ جب کہ جنرل اعظم نے آزاد کشمیر میں اپنی خدمات فوجی افسر کی حیثیت سے سرانجام
دی تھیں۔ ان کی بیٹی کا نام "شاہین" ہے۔ اسی نسبت سے بیگم اعظم صاحبہ نے
میری بیٹی کا نام "ہما" رکھا تھا۔ "شاہین" اور "ہما" دو پرندے ہیں۔

میری بیوی کی صحت اتنی اچھی نہ رہتی تھی مگر اب اپریشن ہونے کے بعد
مکمل بحال ہو گئی ہے اور اب جبکہ دو بیٹے اور ایک بیٹی خدا نے مرحمت فرما دی
تو ہماری یہ خواہش تھی کہ اور کوئی بچہ نہ ہو۔ چنانچہ جو بھی مناسب پرہیز مجھے معلوم
تھا ہم اس پر عمل کرتے تھے مگر خدا کو ایسا منظور نہ تھا۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا
تھا کہ پھر میری بیوی امید سے ہو گئیں۔ ہماری ایک واقف لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان
سے مشورہ کیا کہ اگر ماں کی صحت کی خاطر یہ بچہ ضائع ہو جائے تو ہماری پریشانی
دور ہو سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحبہ بڑے پیار اور گہری ہمدردی سے بولیں کہ لوگوں
کو مانگنے سے بچے نہیں ملتے اور آپ اپنے بچے کو کیوں ضائع کرواتی ہیں۔
لہذا جب میری بیوی نے یہ واقعہ سنایا تو میں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔ چنانچہ
عفت کے ایک سال کے بعد ایک اور بچہ پیدا ہو گیا مگر میری بیوی کی صحت
بالکل گرتی جا رہی تھی یہ بچہ فاروق ہے۔ اس کا نام میں نے خود فاروق رکھا
میرا خیال ہے کہ میرے سب بچوں میں سے یہی بچہ دلیر اور ذہین ہوگا۔ ایک دفعہ
پہاڑ میں جا کر ایک پہاڑی سے گر کر اس بچے کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔
اس بچے نے اس قدر دلیری اور ہمت کا ثبوت دیا جو میرے لئے قابل فخر
بات ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ بچہ غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے —— خداوند

کریم اس کی یاوری فرمائے۔

اس کے بعد میری بیوی کا اپریشن ۶، ۷ سال کے بعد ہوا اب اسے اولاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اس طرح سے میری بیوی کی صحت اب نہایت اطمینان بخش ہے اور ہماری بہت سی پریشانیاں اس بحالی صحت سے ختم ہو گئیں۔

اگر کسی چیز پر مجھے فخر ہے اور کسی چیز کے لئے میں صدق دل سے اللہ کے دربار میں جھک جاتا ہوں تو یہ بچے ہیں۔ ان بچوں سے مجھے اس قدر تسلّی ہوتی ہے کہ اور کوئی دنیاوی نعمت اتنی تسلّی مجھے نہیں دے سکتی۔ یہ میرے اور میری بیوی کے باہمی پیار و محبت کا نتیجہ ہے کہ ہمیں اس قدر صحیح اور گھری خوشی حاصل ہے۔ چنانچہ میری زندگی میں اب ایک ایسا دور آگیا ہے کہ مجھے کسی چیز کی خواہش باقی نہیں رہی۔ جب میری حکومت ۱۹۵۹ء میں پھر ٹوٹ گئی تو میں نے اپنی جگہ یہ فیصلہ کیا تھا کہ باقی عمر محض ان بچوں کی خدمت میں صرف کروں گا۔ اس سے زیادہ خوشی کے لمحات کیا ہو سکتے ہیں۔

وکیل - قانون اور عوام

۱۹۵۵ء میں نے دوبارہ لائسنس حاصل کر کے راولپنڈی میں وکالت شروع کردی۔ راولپنڈی ضلع وکالت کے لحاظ سے اس قدر اچھا ضلع نہیں ہے۔ جن لوگوں سے وکالت کے دوران پالا پڑتا ہے وہ لوگ مالی طور پر پسماندہ ہیں۔ اس کے باوجود معمولی اختلاف ہونے پر عدالتوں تک بلا جھجک پہنچ جاتے ہیں اگر انہیں کچھ وقفہ سوچنے کے لئے مل جائے تو ممکن ہے کہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے

بعد یہ مقدمہ بازی سے دور رہ سکیں۔ موجودہ قانون اس طرح کا ہے کہ فوجداری مقدمات میں جتنی بھی دیر سے آدمی تھانہ میں پہنچے گا اتنا ہی جھوٹا پایا جائے گا کیونکہ معمولی سا جھگڑا ہونے پر فوراً فریقین تھانہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تھانیدار انہیں وہاں کافی عرصہ انتظار میں رکھتے ہیں اور پھر جب اس انتظار میں طبیعت ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور پولیس کے ٹھنڈے رویہ سے اکتا جاتے ہیں۔ تو بسا اوقات اپنی جلد بازی پر پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ تھانے میں پہنچ جانے کے بعد واپس جانا پھر کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ پھر یہ سادہ گاؤں کے لوگ ایک مقررہ چکر سے گزارے جاتے ہیں۔ ان چکروں سے گزرتے ہوئے ان غریب، پسماندہ اور جاہل انسانوں کو ان کی حیثیت سے کہیں بڑھ کر روپے صرف کرنے پڑتے ہیں اور جب معاملہ عدالتوں میں انصاف کی پہلی منزل تک پہنچتا ہے تو آدھی زمین غریب زمیندار کی بک چکی ہوتی ہے یا رہن ہو چکی ہوتی ہے۔

تھانے دار کے چکر سے جو بچ نکلا وہ وکیل کے چکر میں لامحالہ جا پھنستا ہے بعض مقدمات میں معصوم عورتوں کو ان جھمیلوں میں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے لئے بیچ میں لایا جاتا ہے۔ مقدمہ بازی میں جو ابتداً ایک معمولی سا قصہ ہوتا ہے خاندان کے خاندان مالی بحران میں مبتلا ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ سال ہا سال تک ایسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جن کی تفصیل بھی بے حد گھناؤنی ہے اس معاشرتی برائی سے بچنے کے لئے ہمارے ملک میں کئی سکیمیں بروئے کار لائی گئیں اور کئی قسم کے علاج ڈھونڈے گئے۔ مگر میری دانست میں کوئی علاج کارگر آج دن تک ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک پولیس قائم

ہے ۔ عدالتیں قائم ہیں ۔ ٹھنڈے دل سے سارے معاملہ پر غور سے معلوم ہوگا کہ
نظم و ضبط کے نظام کے بغیر کوئی موجودہ سوسائٹی نہیں چل سکتی ۔ جھگڑوں کا کلیۃً سوسائٹی
سے خارج ہونا ناممکن ہے ۔ اس لئے ایسے نظام کا ہونا بھی لابدی دکھائی دیتا ہے
جو باہمی اختلاف کی صورت میں فریقین کے فیصلے کر سکے ۔

پھر عدالتوں میں پہنچ کر انہی غریب لوگوں کا خون کئی سال لا انتہاہی چکر میں سوکھتا
ہے ۔ مقدموں کی تاریخوں کے چکر میں یہ سادہ لوح انسان عدالتوں کے کمروں
کے باہر پریشان ہوتے رہتے ہیں اور اصل معاملہ بنائے مخاصمت بھی عبدل گئے
ہوتے ہیں ۔ عدالتوں کے ضابطے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ عوام کے ذہن سے کلیتاً
بالاتر ہوتے ہیں ۔ ان ضابطوں کی لا انتہاہی پابندیوں سے گزرنے کے بعد جب
عدالت فیصلہ سناتی ہے تو کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا نہ وکیل اور نہ ہی جج کہ
انصاف کس فریق سے ہوا ہے ۔ اور یہ سارا قصہ ایک ضابطے کی پابندی کے
لئے محض ڈرامے کے طور پر تکمیل پاتا ہے ۔ اصل مقصد جو انصاف ہوتا ہے وہ
ان لمبی تفصیلات میں لامحالہ طور پر کھو کر ایک دردناک موت مر جاتا ہے ۔ کاش
کہ اس ملک کے عوام ایک ایسے ضابطے سے آشنا ہوں جو سادہ اور عام فہم ہو
اور جس ضابطے کے بل بوتے پر انسانوں اور بعض اوقات مظلوم اور بے کس
انسانوں کے ساتھ فوری طور پر انصاف ہو سکے !

اگر صاحب عدالت جج راشی نہیں ہے تو بھی عدالت کا چکر ایک سادہ بال جان
ہے ۔ میں ہر وقت یہی دعا مخلصانہ طور پر مانگتا ہوں کہ عدالتوں کے چکر میں خدا
کسی کو نہ ڈالے ۔ اگر عدالتوں کے جج راشی ہوں تو پھر انصاف کی موت ہی نہیں

ہے بلکہ سارے ملک کی موت ہے۔ میرے خلاف کئی بار معمولی معمولی اخباروں نے جھوٹے اور بے بنیاد الزام چھاپے۔ ایسے ایسے الزام لگائے گئے جو ایک معصوم اور بے گناہ انسان کے لئے برداشت سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں تو میرا خون کھولنے لگتا تھا اور انتقام پر طبیعت تیار ہو جاتی تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ کیفیت کم ہوتی گئی اور سیاسی ماحول کی زندگی کا تجربہ بڑھتا گیا۔ ایسی تحریریں طبیعت کو اکسا سکتی تھی۔ ایک دور ایسا آیا کہ میں نے ایسی اخبارات کو پڑھنا بالکل چھوڑ دیا۔ اسی پالیسی پر آج تک پابند ہوں۔ کیونکہ اپنے خلاف جھوٹ پڑھنے پر طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوتی ہے۔ انتقامی جذبے پر فوراً آدمی اترتا ہے جو بردباری اور صحیح سیاست کے خلاف ہے۔ ہر مخالف کا جواب صبر اور دانائی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ کئی مخالفین کمینے اور گھٹیا ہوتے ہیں ان کا جواب دینے سے خاموش رہنا بہتر ہے۔ موزوں پالیسی خاموشی ہی ہے۔ اگر جھوٹے الزام کے پڑھنے یا سننے کے بعد انسان اپنے آپ کو ٹھنڈی سوچ و بچار کا موقعہ دے تو اپنا نظریہ بدل دیتا ہے۔ پھر انتقام کی اکساہٹ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر الزام کا جواب دینا بھی ہو تو پھر جواب کی جگہ منطق کام دیتی ہے جواب بھی بہتر ہوتا ہے اور دشمن کے ساتھ معقولیت کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ میری پوزیشن کے آدمی کو یہ احساس ہمیشہ ہونا لازمی ہے۔ کہ صرف ان آدمیوں کی مخالفت ہوتی ہے جن کی کچھ حیثیت ہو۔ جن کی کوئی حیثیت نہ ہو ان کی مخالفت کون کرتا ہے! اس لئے اگر مخالفت اصولی ہے تو اس کا احترام کر کے اپنے میں اصلاح پیدا کرنی چاہیے۔ اگر مخالفت برائے مخالفت اور ذاتیات

پر مبنی ہے تو ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد اسے اولاً مسترد کر دینا چاہیئے۔ نہیں تو کسی دوسرے کے ذریعے مناسب جواب دلایا جا سکتا ہے۔ جواب خود ہی دینا ضروری ہو تو زبان نرم اور منطقی ہو۔ عامیانہ اور گھٹیا نہ ہو۔ تاکہ دوسرے لوگ معاملہ کا صحیح جائزہ لے سکیں۔

ایسے حالات میں جھوٹے الزامات کی تفصیل لے کر کسی عدالت کی طرف رجوع کرنا اپنی بدنامی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی تک کوئی مؤثر قانون نہیں ہے جو کسی کی ذاتی حیثیت کو بعض اخباروں اور انسانوں کے ذاتی اور غیر مہذب حملوں سے بچا سکے۔ ذاتی حیثیت کی بحالی کے لئے جو معزز شخص عدالت میں مقدمہ لے کر گیا۔ اس کی حیثیت آگے سے بھی لامحالہ خراب ہو جاتی ہے جن لوگوں کو ان نظریات سے اتفاق نہ ہو۔ وہ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

انگلینڈ جیسے ملکوں میں ایسے دعوے کرنے والوں کو معقول معاوضہ ملتا ہے اور اس ملک کا قانون یہ مکمل گارنٹی دیتا ہے کہ ناجائز الزام لگانے والے کی سرزنش عدالت کے انصاف سے کرائی جا سکتی ہے اور جس کی حیثیت پر حملہ ہوا ہے۔ اس کی حیثیت عدالت کے ذریعہ بحال ہو سکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جب تک معاملہ حد سے نہ گزر جائے یا موجودہ قانون میں خاطر خواہ تبدیلی واقع نہ ہو۔ عدالت میں اپنی حیثیت بحال کرانے کے لئے جانا بے وقوفی سے کم نہیں ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے ملک میں ایسے قوانین لاگو کئے جائیں جو شخصی حیثیت اور ذاتی شہرت کے ضامن ہو سکیں۔

مؤکل اور میں

عدالتوں میں کام کرتے ہوئے میرے ذاتی جذبات ہمیشہ کارگر ہوتے ہیں میں اپنے مؤکلوں کے ساتھ ہمیشہ ادب۔ مہربانی اور شفقت سے پیش آتا ہوں میرے لئے اس کے یہ فوائد برآمد ہوتے ہیں کہ میری اپنی طبیعت ایک غریب کے ساتھ مہربانی اور شفقت کرنے سے خوش ہوتی ہے۔ ایسی شفقت کرنے سے میں اپنی طبیعت کے توازن کو اچھی طرح قائم رکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ ساتھ ہی غریب مؤکل کی طبیعت خوش ہوتی ہے۔ کیا وہ پہلے ہی ہزاروں مصیبتوں کا گرفتار نہیں ہوتا کہ میں بھی اس کے ساتھ حاکمانہ انداز میں پیش آؤں اور کیا اس طرح پیش آنے سے میں اس کی کوئی امداد کرتا ہوں؟ اگر ایسا نہیں تو اس طریق کار سے میں کس کی امداد کرتا ہوں؟ پھر اچھے رویئے سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس سے خدا بھی راضی ہوں گے۔ یہی احساس محض آپ کے مزاج کو خوبی سے بحال اور قائم رکھتا ہے۔ کیا ایسے سلوک سے زیادہ اپنا ہی بھلا نہیں ہوتا پھر یہ بات کہ جس شخص کے روپے سے آپ کی روزی اور باعزت روزی مہیا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ترش اور حاکمانہ انداز اخلاقی طور پر کیا کسی طرح بھی جائز ہو سکتا ہے؟

حسن سلوک سے میں نے اپنی سیاسی زندگی میں بے اندازہ فائدے اٹھائے ہیں۔ میں نے محض اچھا سلوک کر کے ہزاروں کارکنوں کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ جو سالہا سال سے میرے لئے مختلف علاقوں میں جنگیں لڑتے رہے ہیں۔

کئی ایسے بھی کارکن ہیں جنہوں نے کئی سال کی قیدیں کاٹیں۔ ایسے بھی ہیں جو میرے کہنے پر خون بھی بہانے سے دریغ نہ کریں گے۔ کوئی لیڈر بھی کسی قوم کو دولت سے راضی نہیں کر سکتا۔ نہ ایسا کوئی لیڈر ہے جو حکومت سنبھالتے ہی مراعات اپنے کارکنوں کو دے سکتا ہے۔ جس سے سارے کارکنان راضی ہو سکیں۔ اپنے حسنِ سلوک سے ایک غیر مطمئن قوم بھی اپنے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ کاش کہ سب اس اصول کے قائل ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیاسی لیڈر اپنے کارکنوں کی کمزوریوں پر درگزر کرتا جائے یا دورانِ حکومت ناجائز اقدامات محض کارکنوں کو خوش کرنے کے لئے کرتا جائے۔ یہ محض خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس معاملے میں اپنی اپنی طبیعت کا بے حد دخل ہے کئی انسان طبیعتاً سخت ہوتے ہیں۔ ان سے نرمی یا ڈپلومیسی یا حسن اخلاق کی پالیسی پر چلنا سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بنے بنائے کام کو منٹوں میں بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ محض یقیناً بھی کئی لوگ کرتے ہیں۔ کئی لوگوں سے ان کی ذاتی کمزوریوں سے یہ نتائج برآمد ہو جاتے ہیں۔ مگر کم از کم ایک ڈاکٹر کا سخت طبیعت ہونا اس کے لئے اتم درجہ خطرناک ہے۔ ایک نرس کے لئے غصے کا مظاہرہ کرنا اس کے پیشہ کے لئے مہلک ہے۔ اسی طرح ایک وکیل کا دورانِ بحث اپنے توازن کو کھو دینا اور غصے سے نیلا پیلا ہو جانا اس کے مخالف وکیل کی کامیابی ہے۔ ٹھنڈا اور متحمل مزاج بہت کم لوگوں کو فطرت نے بخشا ہوتا ہے — گرم مزاج پر کنٹرول کے ٹھنڈے پانی کی بارش کرتے رہنا بڑی بہادری کی بات ہے۔

جج اور وکیل

وکالت کے معاملہ میں بھی میری قسمت بڑی یاوری کرتی رہی ہے۔ مجھے اپنے پیشہ کے حالات سے کسی دور میں بھی مایوسی نہ ہوئی۔ مجھے عدالت کے افسروں کی جانب سے کبھی مایوس رویہ کا سامنا کرنا کم ہی پڑا ہے۔ یہ میری ساری زندگی کا تجربہ ہے۔ میں نے جج سے کبھی جھگڑنے کی صورت پیدا نہ کی۔ اپنی خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ خواہ مخواہ مؤکل کی جگہ خود لینے کی کوشش نہ کی۔ مؤکل بے حد اپنے معاملہ میں اندھا ہوتا ہے وکیل کو اندھا بن کر اندھا ہونے کی مثال پیش کرنے سے اس کا اپنا نقصان ہے۔ اگر جج کے سامنے دونوں طرفین کے معاملہ کو توازن۔ صحیح اور ٹھنڈے دل سے پیش کیا جائے اور معاملہ کے مضبوط پہلو پر زور دیا جائے تو میری دانست میں جج کے دل پر زیادہ اور بہتر اثر ہوگا۔ اگر مخالف کو بالکل جھوٹا اور بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ اپنا صحیح معاملہ بھی توازن کے ساتھ پیش نہ ہو سکے۔ مخالف کے صحیح نکتے کو اخلاقی جرأت کے ساتھ تسلیم کرنا اپنی شخصیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ جھوٹے وکیل کے لئے گو یہ حیثیت اختیار کرنا بڑی مشکل بات ہے۔ ابراہیم لنکن کے متعلق روایت ہے کہ دورانِ مقدمہ بھی اگر علم ہو جائے کہ ان کے مؤکل کا مقدمہ جھوٹا ہے تو اپنی غلطی کو عدالت میں تسلیم کر کے اور عدالت سے معذرت کر کے باہر چلے جاتے تھے۔ ایسے وکیل کی انجام کار شہرت بلند ہو جاتی ہے۔ وکلاء اور عدالت کے افسران وغیرہ

اس کی غیر حاضری میں بھی اس کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ کچھ بحث وکیل کبھی بڑا وکیل نہیں بنا ہے۔ اگر پہلی قسم کا وکیل بڑی عدالت کا جج بن جائے تو پھر اس ملک کے لئے کس قدر خوش بختی ہوگی۔

بعض اوقات عدالتوں کے افسران اپنا رد بہ کم ظرفی کی طرف مائل رکھتے ہیں۔ چھوٹے وکیلوں کی پھبتی اڑاتے ہیں۔ بڑے وکیلوں سے دب کے رہ جاتے ہیں۔ بعض افسران وکیلوں کی آمدنی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے وکیلوں سے اڑ جاتے ہیں اور خود کج بحثی کا شکار ہو کر طبیعت میں ترشی اور کم ظرفی پیدا کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں عدالت کے صحیح کام میں وہ خود رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جس ملک میں انتظامیہ اور عدلیہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں وہاں انصاف روز روشن میں قتل ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات عدالتوں میں انصاف کے لئے غریب عوام بڑی تمنائیں سینوں میں لئے جاتے ہیں ان کے ساتھ انصاف تو درکنار اس قدر زیادتی برتی جاتی ہے کہ صاحب انصاف کے لئے ایسے مناظر دیکھنا بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اس لئے انصاف کے بلند اصول اس بات کے متقاضی ہیں کہ عدلیہ کو ہمیشہ انتظامیہ سے الگ رکھا جائے بہرحال عدلیہ کے اور ہی تقاضے ہوتے ہیں اور انتظامیہ کے مقاصد اور قسم ہوتے ہیں۔ ان دونوں شعبوں کو الگ کرنے سے بالآخر کسی ملک کی بنیادیں تو متزلزل نہیں ہو سکتیں بلکہ ایسے نظام سے ملک میں استحکام ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

جمہوریت کی پامالی

۱۹۵۰ء سے میں سیاسی طور پر حزب مخالف کا لیڈر رہا۔ ۱۹۵۰ء میں آزاد کشمیر

کی صدارت سے مجھے علیحدہ کیا گیا۔ مجھے امریکہ بھیج کر میری عدم موجودگی میں ایک ایسے
سیاسی نظام کی تشکیل کر دی گئی جو میرے مخالف تھا جس میں اس وقت کی حکومت
پاکستان کا ہاتھ تھا۔ آزاد کشمیر کی سیاست حکومت پاکستان کی سیاست سے گہرے طور پر
منسلک ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان اور
ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے لئے بھی یہ کہنا بالکل اسی قدر درست ہے۔ جموں وکشمیر
ریاست کا مسئلہ بالکل آزاد مملکت کا کبھی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر معاملہ زیر بحث
یہی رہا ہے کہ جموں وکشمیر ریاست ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے یا پاکستان کے
ساتھ بالکل آزاد کشمیر کا وجود نہ تو ہندوستان نے کبھی زیر غور لایا نہ ہی پاکستان نے
اس معاملہ کو اس نکتہ نگاہ سے دیکھا کئی دوست (جو آج بھی اقلیت میں ہیں)
اس نہج پر سوچتے رہتے ہیں مگر میری دانست میں جموں وکشمیر ریاست کلیتہً آزاد
رہ کر اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس کا ڈیفنس کا معاملہ نہایت ہی بڑی دشواریوں
سے دوچار ہو جائے گا۔ اس کے چاروں طرف بڑی بڑی ریاستیں ہیں جیسے چین
ہندوستان۔ روس اور پاکستان جب تک ساری ریاستیں باہمی سمجھوتہ کر کے کشمیر کو کلیتہً
آزاد رکھنے اور اس کی آزادی کو بعد میں برقرار رکھنے کا عہد نہ کریں۔ آزاد کشمیر کا وجود قائم
ہونا میری دانست میں بالکل ہی ناممکن ہے۔

اس کے برعکس پاکستان خود کشمیر کے بغیر ایک ادھورا ملک رہ جائے گا۔ جو دریا
کشمیر سے نکل کر پاکستان کی زرخیزی اور نہری نظام کا باعث بنتے ہیں۔ اگر ان پر پاکستان
کا کنٹرول نہ ہو تو ظاہر ہے کہ پاکستان کا سارا زرعی نظام دریاؤں کے تغیر سے بدلا جا سکتا ہے
اگر ان دریاؤں پر پاکستان کا کنٹرول ختم ہو جائے تو پاکستان کا وجود ہی ہمیشہ کیلئے خطرے

میں رہے گا۔ اگر پاکستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے قائم رہنا ہے تو ریاست کشمیر کا الحاق اس کے ساتھ مجھے لابدی دکھائی دیتا ہے۔

میری حکومت سے علیحدگی پر آزاد کشمیر کے حالات کچھ دنوں کے اندر خراب ہو گئے۔ آزاد کشمیر میں ایک سیاسی بحران پیدا ہو گیا اور ایک سیاسی تحریک عدم تعاون کی صورت اختیار کر گئی۔ آزاد کشمیر کی حکومت محض سڑکوں پر تھی ورنہ آزاد کشمیر کے تمام دیہات میں عوام الناس نے مکمل عدم تعاون کر رکھا تھا۔ عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ پولیس سے اور باقی حکومت کے محکمہ جات سے بھی مکمل بائیکاٹ کر دیا گیا حکومت پاکستان سے تعاون ہوتا رہا۔ جب بھی کوئی یو۔ این۔ او کے افسر کا آزاد کشمیر میں وارد ہوتا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ سیاسی تحریک محض آزاد کشمیر کی حکومت کی تبدیلی کے خلاف تھی۔ پاکستان کے خلاف کوئی فرد بھی نہیں تھا۔ آزاد کشمیر کے عوام الناس نے یہ فرق بہر صورت ہر دور میں قائم رکھا کہ پاکستان کی حکومت سے اختلاف رائے اور معاملہ ہے اور پاکستان کے ملک کے ساتھ وفاداری ایک اور ہی معاملہ ہے۔ کسی دور میں بھی آزاد کشمیر کے عوام الناس نے پاکستان کیساتھ الحاق کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی اور یہ کشمیری عوام کی فراست اور دانائی اور بلند نظری کا ثبوت ہے ورنہ ایسے دور بھی آزاد کشمیر کی سیاست میں ضرور آئے ہوں گے۔ جب کہ چند افسروں نے آزاد کشمیر کے عوام الناس پر بڑی سختیاں روا رکھیں مگر یہ سختیاں کبھی بھی مملکت پاکستان کے ساتھ وفاداری میں کوئی فرق یا لغزش پیدا نہ کر سکیں اور یہ بات میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں۔

جب یہ تحریک ۱۹۵۰ء کی ابتدا میں شروع ہوئی تو یہ میرے علم کے بغیر اور پھر میری مرضی کے خلاف ہوئی مگر بعد میں مجھے اسے اپنانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ یہ معاملہ بہر حال ایک اصول کی جنگ اختیار کر گیا تھا۔ اصول یہ تھا کہ آزاد کشمیر کی حکومت وہاں کے عوام الناس کی مرضی سے بنے یا محض راولپنڈی میں بیٹھ چند افسر اس کی تشکیل کریں۔ اس نازک دور میں آزاد کشمیر کے عوام الناس نے اس اصول کی خاطر پھر بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ اس وقت کی پاکستان کی حکومت نے اس معاملہ کو بڑی کم اندیشی سے اور بڑی تنگ نظری سے سلجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ سترہ ماہ تک یہ تحریک چلتی رہی۔ بالآخر حکومت حالات سے مجبور ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم پاکستان اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے راولپنڈی تشریف لائے تھے جب کہ وہاں راولپنڈی کے ایک پبلک اجلاس میں انہیں بیرحمی سے قتل کر دیا گیا۔ ان کے قتل کا کسی قسم کا تعلق آزاد کشمیر کی اس تحریک سے نہ تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد (جب خواجہ ناظم الدین صاحب کی قیادت میں ایک حکومت کراچی میں بن چکی تھی) اس تحریک کے اصول کو اپنایا گیا اور حکومت پاکستان کے مشورے سے ۱۹۵۰ء والی حکومت کو توڑ دیا گیا۔ ایک نئی عبوری حکومت بنائی گئی۔ یہ اصول بھی تسلیم کیا گیا کہ آئندہ آزاد کشمیر کے عوام الناس کی رائے عامہ کو ملحوظ رکھ کر نئی حکومت کی تشکیل ہو گی۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے الیکشن کرائے گئے۔ چھ ماہ کی کاوشوں اور الیکشنوں کے بعد جب معاملہ پھر جنرل کونسل کے سامنے رکھا گیا تو ایک صدر حکومت کا انتخاب ہوا مگر حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر نے یہ انتخابات تسلیم کرنے

سے انکار کر دیا اور ایک نئی قسم کی حکومت بنائی گئی جس کا مسلم کانفرنس سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ جمہوری اداروں کی تو بڑی شکست تھی مگر چند افسروں کی سازشوں کی کامیابی تھی۔ پھر اس حکومت کے خلاف بھی کم و بیش چار سال تک حزب مخالف کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کام کرتی رہی۔ سیاسی تحریک چلانے کے لئے کسی میں بھی اب سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس دوران وزارتِ اور کشمیر کے مختلف افسران میں اپنی جنگیں شروع ہو گئیں۔ ان کی ذاتی جھگڑوں کے نتیجہ میں حالات بدلتے رہے اور عوام الناس کی رائے کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔

سیاسیاتِ پاکستان اور کشمیر

۵۵-۱۹۵۴ء میں پاکستان میں عام انتخابات ہونے شروع ہوئے۔ پاکستان میں صوبوں اور مرکز دوں میں مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ مگر اس کے خلاف اب بہت سی اور بھی سیاسی جماعتیں میدان میں آچکی تھیں۔ مسلم لیگ خود اتنا عرصہ اقتدار میں رہنے کے بعد اندرونی خرابیوں سے کمزور ہو چکی تھی۔ خود مسلم لیگ کو کوئی آزاد اور دلیر لیڈر حاصل نہ کر سکا۔ وزیر اعظم پاکستان نے خود ہی مسلم لیگ کی صدارت بھی سنبھال لی جو پاکستانی سیاست کے لئے سب سے بڑی خرابی کا باعث ہوا۔ مسلم لیگ محض وزیر اعظم پاکستان کی گڑیا بن کر رہ گئی۔ اس کی حیثیت ایک آزاد اور مضبوط سیاسی پارٹی کی ختم ہو گئی۔ خود مسلم لیگ حکومتوں نے اپنے ہاتھوں سے مسلم لیگ کی حیثیت ختم کی اور اسے زمین تلے دفنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ صوبوں کے وزیر اعلیٰ بھی صوبائی مسلم لیگ کے صدر

بن گئے اور جس طرح مرکز میں مسلم لیگ ختم ہوئی اسے بدتر طریقہ سے صوبوں میں بھی ختم ہو گئی۔

جب مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کے لئے انتخابات ہونے لگے۔ تو مجھے محمد علی بوگرہ وزیراعظم پاکستان نے ذاتی طور پر حکم دیا کہ جا کر مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ کے حق میں تقریریں کروں۔ یہ میرے لئے اور کشمیری سیاسیات کے لئے کوئی موزوں اقدام نہ تھا مگر مسلم لیگ سے مجھے اس قدر عقیدت تھی کہ کوئی بھی قربانی اس کی زندگی کے لئے بڑی نہیں تھی۔ چنانچہ محترمہ مس فاطمہ جناح کو بھی اس کے لئے آمادہ کیا اور سارے مشرقی پاکستان میں تین ماہ کے لگ بھگ میں نے مختلف مقامات پر تقاریر کیں۔ کشمیر کے معاملے میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بھی اسی قدر دلچسپی ہے۔ جتنی کہ مغربی پاکستان کے عوام کو ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے تو میں نے مشرقی پاکستان کے عوام کو کشمیری لوگوں کے زیادہ نزدیک پایا۔ جب میں نے مختلف مقامات پر اپنی تقاریر میں کشمیر کے عوام پر مظالم کی داستانیں بیان کیں کئی سامعین کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ میں نے ہر جگہ اپنے مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کیا اور اس کی وجہ سے میرا ذاتی احترام کیا گیا جس کی مجھے بے حد قدر ہے۔ ورنہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آ کر تقریر کرنا ان ایام میں بڑی مشکل بات تھی ——— وہاں کے سارے عوام اور افسران مسلم لیگ کے خلاف تھے یہ وجہ تھی کہ اتنی کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا مجھے بے حد افسوس تھا۔ حزب مخالف کی دلیلیں بڑی وزنی تھیں۔ مشرقی پاکستان نے مسلم لیگی حکومتوں کے دوران میں ایسے قحط کا سامنا کیا تھا کہ تفاصیل سننے

سے کلیجہ منہ کو آتا تھا چونکہ مشرقی پاکستان میں غربت عروج تک پہنچ چکی تھی اور اس پر تین چار سال تک قحط کا ہونا وہاں کے عوام الناس کے لئے قیامت سے کیا کم ہوگا۔ پھر وہاں ایسے لوگ ابھی تک کام کر رہے تھے جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر پاکستان کی سرحدوں سے ناجائز طور پر مال برآمد کیا تھا اور کر رہے تھے۔ پاکستان کی حکومت کے لئے اس سے زیادہ تباہ کن اور کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی تھی۔

ادھر غربت کی یہ حالت تھی کہ غریب عوام معمولی ضروریاتِ زندگی کے لئے تڑپ رہے تھے اور مشرقی پاکستان کا مال بے رحمی سے سرحدوں کے اس پار بھیجا جا رہا تھا اس طرح سارے پاکستان کا زرمبادلہ ضائع ہو رہا تھا۔ زرعی نظام اس طرح کا تھا کہ غریب کسان کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا تھا۔ زراعت ان لوگوں کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوتی تھی۔ بے اندازہ چاول ہندوستان برآمد ہو رہا تھا اور ملک کے عوام بھوکوں جان دے رہے تھے۔ مویشیوں کی پرورش کا طریقہ دیکھنے سے ہی ذی عقل انسان قائل ہو جاتا تھا کہ یہاں بھی ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ سماجی۔ اقتصادی اور سیاسی نظام اس صوبے میں ہر روز تباہی کی جانب جا رہا تھا اور یہ حالات دیکھ کر مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی تھی کہ اس صوبے کے حالات پر اگر جلد ہی قابو نہ پایا گیا تو یہ صوبہ ایک ایسے انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے کہ نہ جانے اس انقلاب سے ملک کی بہتری ہوگی یا پہلے سے بھی بدتر حالت ہو جائے گی۔

کراچی پہنچ کر میں نے یہ تاثرات متعلقین کی خدمت میں عرض کر دیئے۔

مگر کراچی کے سیاسی حالات ایسے نہ تھے جن میں میری بات کا کوئی اثر نہ تھا۔ بہ حال حالات ویسے بھی اس قدر ابتر ہو چکے تھے۔ کسی علاج کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی میں نے اس وقت کے گورنر جنرل صاحب (جن کی اپنی بیماری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک دن کے لئے بھی ان کا اس کرسی پر رہنا خطرناک تھا) سے ساری تفصیل کہہ دی تو وہ فرمانے لگے "تم کیا سمجھتے ہو کہ کسی جگہ میونسل الیکشن سے مرکزی حکومت بدل جائے گی؟" یہ ان کی محض طفل تسلی والی بات تھی۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست ایک انقلاب کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس حقیقت سے پہلوتہی بڑی نادانی تھی۔ اس دور میں ایک لیڈر ہر دوسرے کی نگاہ میں ایک غدار تھا۔ اس لفظ کا استعمال اس قدر عام ہو چکا تھا کہ اگر کوئی غدار تھا تو اس کی شناخت اتنے "غداروں" میں بڑی مشکل بات تھی۔

ہر ایک خطرناک انقلاب کی تیاری میں تھا۔ اس سیاسی نقشے کے پس منظر میں سوشل نظام درہم برہم ہو رہا تھا انسانی دیانت بہت کم رہ گئی تھی کراچی کا ماحول تجارتی پرمٹوں کے چکر سے مکمل طور پر مرعوب ہو چکا تھا۔ افسران کوٹھیوں کی تعمیر میں صبح و شام مصروف تھے۔ کوئی افسر اپنے دفتر میں ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرتا تھا اور دو تین فائلوں پر دستخط کرنے کے بعد اپنی ذاتی کوٹھی کی دیکھ بھال کے لئے چلا جاتا تھا۔ یا کراچی کے کاروباری لوگوں کے چکر میں پھنس کر عیش کی داد دے رہا تھا۔ مرکزی وزیر چوبیس گھنٹے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں وقت صرف کر رہے تھے۔ ہر سرکاری محکمے میں سازشوں کا بول بالا تھا۔

کشمیر برائے تشہیر

کشمیر کے مسئلہ پر غور کرنا محض اخباروں میں نام پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جس لیڈر کو سب سے بڑی خبر چھپوانی ہو اسے کشمیر پہ بیان دینے کی ضرورت تھی اور بس! اگرچہ عوام اب بھی کشمیر کے مسئلہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے ملک کے سارے اخبارات کشمیر کے متعلق خبریں چھاپ کر اپنی بکری بڑھاتے تھے۔ چنانچہ محمد علی بوگرہ صاحب جب وزیر اعظم تھے تو دہلی تشریف لے گئے مگر وہاں پنڈت نہرو نے انہیں اصل موضوع پر گفتگو کا موقعہ ہی نہ دیا۔ بلکہ حبہ خاتون (جو کشمیر کی مایۂ ناز شاعرہ تھیں) کے قصے میں معروف رکھا۔

ادھر کشمیر میں شیخ عبداللہ کو حکومت کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ڈسمس کر دیا گیا اور سری نگر میں ہندوستانی فوج نے ہزاروں انسانوں کا خون شہر میں بہایا۔ محمد علی بوگرہ صاحب کا دہلی بلایا جانا محض سری نگر کے قتل عام پر پردہ ڈالنا تھا اور بس۔ پنڈت نہرو جب تک زندہ رہے وہ بھی کشمیر کا کوئی جائز اور انصاف پر مبنی فیصلہ نہ کر سکے جس کی وجہ محض یہ ہے کہ پنڈت نہرو اس معاملہ کو صرف اپنے ملک کے نکتۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں جو محض خودغرضی پر ہی مبنی ہو سکتا ہے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ مگر آج کی دنیا میں انصاف اور اس کے تقاضوں کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اس دنیا میں محض طاقت کی پرستش ہوتی ہے اور اس دور میں ایٹم بم ہی اپنی طاقت تسلیم کروا سکتا ہے۔ عوام کی آواز دبائی جا سکتی ہے اور طاقت کے ساتھ ٹکا

آسانی سے دبائی جاسکتی ہے مگر نہرو جیسوں کے لئے بھی ایک انجام ضرور ہوتا ہے چاہے اس پر ایک زیادہ طاقت ور حکومت آ سے یا خود ملک کے اندر ایسی طاقت پیدا ہو جو نہرو جیسوں کے اقتدار کو ختم کرنے کا باعث بنے۔ اور اس کے بعد بھی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد آنے والے صاحب کا روّیہ کیا ہوگا۔ اگر وہ سخت قسم کا مذہبی اور ہندو وزیراعظم ہوا تو حالات بدتر ہو جائیں گے۔ اگر سوشلسٹ قسم کا درمیانہ قسم کا عقیدہ رکھنے والا وزیراعظم ہوا تو حالات اچھے ہونے کی امید بھی ہوسکتی ہے۔

محمد علی بوگرہ صاحب کے بعد چوہدری محمد علی صاحب وزیراعظم بنائے گئے تو باہر کے اخبار والے اس مصیبت میں گرفتار ہوئے کہ بالآخر ان دونوں ناموں میں فرق کے لئے کون سا لفظ استعمال ہو۔ چنانچہ پہلے محمد علی کے جانے کے بعد ان کے ساتھ بوگرہ لگا دیا گیا۔ جہاں کے کہ وہ رہنے والے تھے۔ تب یہ مشکل حل ہوسکی۔ دوسرے محمد علی صاحب نے ۱۹۵۵ء میں ایک آل پارٹیز کشمیر کانفرنس بلائی جس کا وعدہ پہلے محمد علی صاحب بحیثیت وزیراعظم کرچکے تھے۔

بظاہر کشمیر کے لئے کوئی مؤثر اقدام کوئی حکومت پاکستان بھی نہ کرسکتی تھی کیونکہ ہندوستان کے وزیراعظم کسی بات پر بھی رضامند نہیں ہونے تھے۔ یہ روّیہ اس لئے بھی وزیراعظم ہندوستان کا تھا کہ پاکستان میں آئے دن حکومتوں کے تبدیل ہونے سے پاکستان کی سودابازی کرنے کی طاقت بالکل معطل ہو چکی تھی چنانچہ ایک بار وزیراعظم ہندوستان نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ آخر

میں بات کس سے کروں پاکستان کے وزیراعظم ہر دوسرے روز تبدیل ہو جاتے ہیں گو یہ معاملہ ہم سب پاکستانیوں کے لئے باعثِ تشویش تھا۔ اس حقیقت سے انکار بھی بڑی نادانی کی بات ہے۔ سیاسی بحران جو پاکستان میں ہر دوسرے روز رونما ہوتے تھے ان سے بیرونی دنیا میں پاکستان کی حیثیت کو بڑی زک پہنچی تھی۔ اس صورت حال سے ہندوستان نے پورا فائدہ اٹھا کر پاکستان کے خلاف بیرونی ملکوں میں خطرناک قسم کا زہر پھیلا دیا تھا

آل پارٹیز کشمیر کانفرنس

چودھری محمد علی صاحب نے وزیراعظم کی حیثیت سے کراچی میں کشمیر کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کی جس میں پاکستان کے دونوں حصوں سے ایک سو کے لگ بھگ راہنما جمع ہوئے۔ سہروردی صاحب اس وقت مرکزی قانون ساز اسمبلی میں حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے تھے۔ ان سے ہم لوگوں نے جا کر ملاقات کی۔ ہم میں سارے وہ لوگ تھے جو وزارتِ امور کشمیر کے خلاف تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آزاد کشمیر کی خرابیوں کی ذمہ دار محض وزارتِ امور کشمیر کے مختلف افسران ہیں ہم نے بڑے زور کے ساتھ سب راہنماؤں کو مطلع کیا کہ وزارت امور کشمیر کے افسروں کی وجہ سے آزاد کشمیر کے حالات بد سے بدتر ہونے جا رہے ہیں۔ اس کانفرنس سے چند ماہ قبل پونچھ میں پنجاب سے پولیس بھیج کر سختیاں بھی کرائی گئیں تھیں اگرچہ وہاں کے لوگوں سے کچھ زیادتیاں بھی ہوئی تھیں مگر یہ سختیاں محض سکندر مرزا صاحب (جو اس وقت وزیر داخلہ تھے)

اور سردار ممتاز علی صاحب جو وزیر امور کشمیر تھے نے محض سارے پاکستان میں وحشت پھیلانے کے لئے کی تھیں۔ ان لوگوں کا خیال تھا اور خصوصاً سکندر مرزا صاحب کا کہ حالات مزید بدتر کئے جائیں۔ تاکہ پاکستان میں ہنگامی حالات کا اعلان کر کے سکندر مرزا صاحب اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ اس ماحول کو تقویت پہنچانے کے لئے بعد میں ۱۹۵۸ء میں سکندر مرزا صاحب نے پھر آزاد کشمیر اور پاکستان میں ایک تحریک چلوائی جس کا مقصد محض ایسے حالات پیدا کرنا تھا کہ جن کی وجہ سے پاکستان میں ہنگامی حالات کے لئے جواز پیدا ہو سکے۔ یہ تحریک جس کا نام کے۔ ایل۔ ایم رکھا گیا تھا محض سکندر مرزا صاحب کے دماغ کی تخلیق تھی۔ اور اس نے اس تحریک کے لئے فنڈز بھی مہیا کئے تھے۔ سکندر مرزا صاحب نے مجھے نتھیا گلی میں خود بتایا کہ اس تحریک کا اصل مقصد یہ ہے مگر ساتھ ہی اس تحریک کی ناکامی کا بھی اعتراف کیا کہ امریکی سفیر نے بھی انہیں بتایا ہے کہ اس تحریک کے پیچھے کچھ بھی نہیں تھا اور ایک ہفتہ کی میعاد کے اندر یہ ناکام ہو کر رہ گئی تھی۔

سکندر مرزا صاحب

جو لوگ سکندر مرزا صاحب سے واقفیت رکھتے تھے انہیں ان کی اس سکیم کا علم تھا اور جب ۱۹۵۸ء میں فوجی انقلاب ہوا تو پاکستانی فوج کے بڑے بڑے جرنیل سکندر مرزا کی اس پس پردہ تحریک سے واقف ہو گئے اور انہیں علم ہو گیا کہ سکندر مرزا فوجی انقلاب کو بھی اپنے ذاتی اغراض کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں لہذا ایک ماہ سے طویل عرصہ کے اندر اندر سکندر مرزا کو اپنے عہدہ جلیلہ سے ہاتھ

دھو نے پڑ گئے۔ جس پریشان حالی میں سکندر مرزا اپنی محترم بیگم کے ہمراہ اس ملک سے نکالے گئے۔ اس کی کم ہی مثالیں مل سکتی ہیں اور اس سلوک کے پوری طرح مستحق تھے کیونکہ وہ تحریک پاکستان کو اور ملک پاکستان کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور کسی بھی اقدام سے گریز نہ کرتے تھے چاہے وہ ملکی مفاد کے خلاف بھی کیوں نہ ہو۔

وزارت امور کشمیر توڑ دو؟

پونچھ اور آزاد کشمیر کے عوام نے جن مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ ان مشکلات کو میں اس آل پارٹیز کی کانفرنس میں رکھنا چاہتا تھا اور حکومتی مظالم کی تفصیل بیان کرنا چاہتا تھا مگر محمد علی صاحب نے اپیل کی کہ ایسے مظالم کی تشہیر سارے پاکستان کی بدنامی کی صورت ہوگی۔ اس لئے ان کی تجویز پر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے ایک اچھی تقریر کشمیر کے عام مسائل پر کی۔ جو بے حد پسند کی گئی۔ سہروردی صاحب اور چودھری محمد علی صاحب دونوں نے یہ تقریر پسند کی اور پھر جب ہم سب کشمیری لیڈروں نے مطالبہ کیا کہ وزارت امور کشمیر توڑ دی تو چودھری محمد علی صاحب نے وعدہ کرنے کے باوجود انکار کر دیا اور میں نے اس کانفرنس سے بطور احتجاج واک آؤٹ کر دیا۔ میرا ساتھ چودھری نور حسین صاحب میر پور والے نے دیا۔ باقی تمام کشمیری لیڈروں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں سوائے چند لیڈروں کے جنہیں وزارت امور کشمیر کے افسروں نے وظیفے دے کر اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا اس کانفرنس کا نتیجہ مسئلہ کشمیر کے حل کے متعلق کچھ بھی نہ نکلا۔ چودھری

محمد علی صاحب کی اور بھی کرکری ہوئی مسئلہ کشمیر سے ذاتی طور پر چودھری محمد علی صاحب کو شروع میں بڑی دل چسپی ہوا کرتی تھی، اس میں کوئی کلام نہیں۔ مجھے اس کا ذاتی اعتراف ہے مگر آزاد کشمیر کی سیاسیات میں ان کا دخل محض تعصب پر مبنی تھا اور اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو فریق بنا لیا اور وزیر اعظم کی حیثیت سے خصوصاً ایسا کرنا ان کے لئے میری دانست میں درست نہ تھا۔

محمد علی صاحب کے بعد سہروردی صاحب وزیر اعظم ہوئے۔ آزاد کشمیر کی سیاسیات میں ان کے وزیر اعظم بننے سے تبدیلیاں متوقع تھیں۔ مگر مسلم کانفرنس کی متحد کوششوں سے سردار عبدالقیوم خان کو مسلم کانفرنس کی کنونشن میں صدر منتخب کیا گیا جس کی سو فی صد منظوری وزیر اعظم پاکستان دینے کے لئے تیار نہ تھے اور اسی دن سے آزاد کشمیر میں قیوم خان کی حکومت مشکلات میں گر گئی تھی۔

نمائندہ حکومت

اس حکومت کی تشکیل سے پہلے تمام کانفرنس کے لیڈروں میں اتفاق رائے حکومتِ پاکستان کی مرضی سے کرایا گیا اور اس اتفاق کی سکیم کے تحت ایک کنونشن مظفر آباد میں بلائی گئی۔ پانچ سو نمائندگان کی موجودگی میں میں کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے منتخب ہوا۔ سردار عبدالقیوم خان حکومت کے لئے صدر منتخب ہوئے تھے مگر ابھی آزاد حکومت کی کابینہ کا اعلان نہ ہوا تھا کہ مرکز میں

یعنی کراچی میں حکومت تبدیل ہوگئی۔ سہروردی صاحب وزیراعظم ہوگئے انہیں یہ معاملہ پسند ہی نہیں تھا تاہم ان کے اظہار ناراضگی کے باوجود ایک کابینہ آزاد کشمیر میں بن گئی۔ یہ کابینہ اپنی جگہ بڑی بدقسمت تھی کہ اس کے پیچھے سارے راہنمایانِ آزاد کشمیر تھے اور ساری مسلم کانفرنس کی جماعت ان کی پشت پناہی کر رہی تھی مگر اس حکومت سے کوئی ایسا کام نہ ہو سکا جس سے اس کا وقار بڑھتا یا آزاد کشمیر کے وقار میں کوئی اضافہ ہوتا۔ میں نے مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے جس قدر مکمل اس کی پشت پناہی ہو سکتی تھی، کی۔

اس حکومت کو بنے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے کہ مجھے کراچی بلا کر حکومت پاکستان کی جانب سے کہا گیا کہ میں حکومت آزاد کشمیر کی صدارت خود سنبھال لوں میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ اس پر سہروردی صاحب وزیراعظم مجھ سے ناراض ہو گئے۔ چو این لائی کی خدمت میں میر واعظ صاحب کو پیش کیا۔ ان کی تصاویر چھپوانے کے لئے ایک اہتمام کیا گیا۔ چند ماہ اور گزرے تو میرے لئے پھر پیغام آیا۔ اس وقت اس حکومت سے ضرور کچھ ایسی باتیں سرزد ہو گئی تھیں جن کا معاف کرنا حکومت پاکستان کے لئے ناممکن تھا۔ یہ بات مجھے سکندر مرزا صاحب (جو اس وقت صدر پاکستان تھے) نے بلا کر کہی اور کہا کہ اگر میں صدارت خود نہیں سنبھالتا تھا تو وہ دوسرے کسی صاحب کو صدارت دے دیں گے۔ اس سے حالات خراب ہوئے تو ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گی۔ بہرحال میں نے صدر بننے کے لئے اپنی رضامندی باقی دوستوں کے مکمل مشورے سے دی۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں پھر آزاد کشمیر کا صدر بنا۔ میں نے صدارت مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت

سے سنبھالی اور ورکنگ کمیٹی مسلم کانفرنس نے مجھے مکمل اختیارات سونپ دیے۔
اس صدارت کے دوران مجھے پہلے حکومت خود چلانا پڑی۔ کیونکہ حکومت پاکستان سے کابینہ کے معاملے میں مکمل اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ جب آزاد کشمیر میں ایک تحریک آزادی کشمیر کے نام پر چلائی گئی تو مرکزی حکومت بھی بدل چکی تھی اور درحقیقت اس تحریک کا نشانہ میرے علاوہ اس وقت کی حکومت پاکستان بھی تھی۔ اس وقت پاکستان کے وزیراعظم فیروز خاں نون صاحب تھے چنانچہ پاکستانی پریس نے کے ایل ایم کی تحریک کی جو امداد کی وہ اس لئے تھی کہ زیادہ طبقہ پریس والوں کا حکومت پاکستان کے خلاف تھا اور حکومت کے خلاف کسی محاذ پر مخالفت ہوئی۔ میں نے حکومت پاکستان کا استعفیٰ دیا اصولاً بھی اس تحریک کے لیڈروں کی تقاریر سے یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ اس تحریک کا وہی حشر ہوگا جو سکندر مرزا صاحب کا جو اس کے اصل محرک تھے ا ہوا۔ یہ تحریک ناکام ہوئی۔ پاکستان میں مارشل لاء حکومت کے نفاذ کے بعد اس تحریک کے لیڈروں کو رہا کر دیا گیا اور پھر انہیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ ہوئی۔

منگلا ڈیم کی تعمیر

میرے اس دور میں سب سے بڑا مسئلہ منگلا ڈیم کی تعمیر کا بھی سامنے آیا۔ جب میں نے صدارت سنبھالی تو اس تعمیر کی بے حد مخالفت میرپور ضلع میں ہو رہی تھی جہاں اس منصوبہ کی تکمیل ہو رہی تھی۔ یہ منصوبہ بذات خود ایک مفید منصوبہ ہے محض پاکستان کے لئے ہی نہیں بلکہ آزاد کشمیر کیلئے

بھی میں نے حکومت پاکستان کے افسران سے گفتگو کر کے پہلے اپنے بڑے بڑے اصولوں کی بنیاد پر حکومت پاکستان کی حمایت حاصل کر لی اور ان اصولوں کو سامنے رکھ کر میں نے سارے متاثرہ علاقے کا دورہ کیا۔ اس علاقے کے عوام الناس کے سامنے میں نے ساری پوزیشن نہایت صاف الفاظ میں رکھ دی۔ حکومت پاکستان کی جانب سے کئے گئے۔ مواعید سے انہیں آگاہ کیا۔ یہ میری سیاسی قابلیت کا کڑا امتحان تھا کیونکہ میرپور کے اس طرح بے گھر ہونے کا مسئلہ تھا۔ ادھر پاکستان کی اقتصادی بقاء کا سوال تھا۔ دونوں معاملے ایسے تھے جن کے ساتھ مجھے بے حد دلچسپی تھی کہ اس معاملے کے حل میں میں ناکام ہوا تو باقی لیڈروں میں اور مجھ میں آخر فرق کیا ہوگا۔ آزاد کشمیر میں میری پیشرو حکومتوں نے اس معاملہ کے حل سے پہلوتہی کی تھی اور معاملہ بگڑ چکا تھا کہ منگلا ڈیم منصوبہ کے کچھ افسران بھاگ کر چلے گئے تھے اور باقی افسران مایوسی کے عالم میں تھے۔

خدا نے ان معاملات کو سلجھانے میں غیر معمولی کامیابی دی۔ منگلا ڈیم کی تجویز میں نے میرپور کے عوام سے پبلک جلسوں میں منظور کروائی۔ میں نے میرپور کے عوام سے ذاتی طور پر اور آزاد حکومت کی جانب سے وعدے کئے۔ اللہ کرے ان وعدوں پر مکمل طور پر عمل کیا جائے اور مجھے کوئی وجوہات دکھائی نہیں دیتیں کہ ان مواعید پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔ اس وقت تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس سے یہ ظاہر ہو کہ کوئی بھی متعلقہ حکومت ان وعدوں پر عمل کرنے سے قاصر رہی ہے اور منگلا ڈیم منصوبہ کامیابی کے ساتھ تکمیل پا رہا ہے۔

اور آئین معطل ہوگیا۔۔۔۔۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مہینے میں مارشل لاء کا نفاذ ہوگیا۔ سارے صوبوں میں اور مرکز میں آئینی حکومتیں صدر پاکستان کے حکم سے توڑ دی گئیں۔ یہ حقیقت ہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک پاکستان کے آسمان سیاست پر جتنے بھی ستارے چمکے ان میں سے کسی میں بھی غیر معمولی قابلیت نہ تھی اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قائد اعظمؒ کے بعد پاکستان میں کوئی سیاست دان بھی ایسا سامنے نہ آسکا جس میں قائد اعظمؒ جیسی فراست دیانت داری اور دوراندیشی ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ خود قائد اعظمؒ ایک حسرت پہلو میں لئے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ اور جتنے بھی اس ملک میں سوشل، سیاسی اور اقتصادی بحران پیدا ہوئے ان کے لئے ہم سیاست میں حصہ لینے والے لوگ ذمہ دار تھے۔ سیاسی جماعتیں بھی بحیثیت جماعت ختم ہوگئیں۔ مسلم لیگ جو صحیح طور پر منظم جماعت تھی بھی لونڈی کے طور پر بے دردی سے استعمال ہونے لگی۔ اچھے اچھے مخلص کارکن اس سے الگ ہوتے گئے۔ اس کی تنظیم اور اخلاص آہستہ آہستہ ختم ہوگیا۔ اس کے تحت صوبوں میں جو حکومتیں بنیں وہ نہ تو قابلیت کے سہارے بنیں اور نہ ہی اصولوں کی بنیاد پر یہ حکومتیں چلائی گئیں۔ قیادت کے خواب دیکھتی ہوئی ساری کی ساری قوم دولت کے حصول کے پیچھے بھاگ پڑی۔ اس دور میں صرف چند ہی انسان ہوں گے جنھیں موقع ملا اور انھوں نے اس دوڑ میں حصہ نہ لیا ہو۔ جب دولت کی خواہش اندھی ہو جائے تو اس کا حشر

بھی ہوتا ہے۔ ان حکومتوں کے بڑے بڑے صلاح کار افسر بھی اُسی قدر دولت کی اس دوڑ میں بڑھ بڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ میں مانتا ہوں کہ چند ایسے سیاست دان ضرور تھے جو اپنی مجبوریوں سے یا خودداری کے اصولوں کو اپنانے کی وجہ سے اس دوڑ سے الگ رہے۔ اسی طرح ایسے افسر بھی ضرور ہوں گے جو اس قیامت خیز دوڑ سے الگ رہے ہوں گے۔ اس ساری تباہی کی ذمہ داری سیاست دان کے کندھے پر رکھی جا سکتی ہے۔ میں اپنے آپ کو بھی اسی قدر ان حالات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ میں معمولی سی پوزیشن کا سیاست دان تھا۔ اور پاکستان کی سیاسیات میں میرا بہت ہی کم دخل تھا۔

برج کے کھلاڑی

اس دور میں وزیر امور کشمیر کے عہدہ پر ایسے ایسے لوگ فائز ہوئے جن کو اچھے دور میں ایک کلرک کا عہدہ بھی اطمینان کے ساتھ سونپا نہیں جا سکتا تھا یا ایسے ایسے بوڑھوں کو یہ عہدہ سونپا گیا کہ ان کی پرورش ہو سکے۔ ان شخصیتوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی ذاتی حیثیت کبھی بھی کچھ نہ تھی۔ لیکن کشمیر کی آزادی کی جنگ کے لئے ان کا انتخاب موزوں سمجھا گیا۔ ان باتوں کا جس قدر بھی رونا رویا جائے کم ہے۔ ان وزیروں نے اپنے لئے ایسے ایسے افسروں کا انتخاب کیا جو ان کے ساتھ بیٹھ کر محض خوب صورت طریقہ سے تاش (برج) کھیل سکتے تھے۔ جون کے مہینے میں مری کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضاؤں میں یہ لوگ بڑے مزے سے تاش کھیلتے تھے اور آزاد کشمیر کے لیڈروں کے نام سے ناک

چڑھا کر آسمان تک لے جاتے تھے۔ کشمیر کے لوگوں سے اظہار نفرت کرتے تھے
ان وزیروں میں سے ایک راولپنڈی دورہ پر تشریف لا رہے تھے (جو محض ٹی۔اے
بنانے کے لئے ہوتا تھا) کہ پیچھے کراچی میں حکومت ٹوٹ گئی۔ تو ان وزیر
صاحب کی ٹرین والی بڑی بوگی کھو گئی اور وہ عجیب پریشانی کی حالت میں
سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں کراچی واپس پہنچے تو سٹیشن پر ان کے استقبال
کے لئے کوئی موجود نہ تھا!

ہماری قسمت میں ایک دوسرے صاحب وزیر کی حیثیت سے آئے
ان کا سر بڑھاپے کی وجہ سے متواتر ہلتا تھا۔ اتنی بڑی لافیں مارتے تھے
کہ سارا ہندوستان ان کی ذاتی جدوجہد سے آزاد ہوا ہے۔ اگر ان کی ذاتِ گرامی
نہ ہوتی تو انگریز ہندوستان چھوڑ کر کبھی نہ جاتے۔ سب سے پہلے ہر وفد سے
اپنی ذاتی شخصیت کا تعارف کراتے تھے۔ جب ان کے ساتھ کام کرنے کا
مجھے تجربہ ہوا تو مجھے ان سے بہت مایوسی ہوئی۔ جب ان کی تعیناتی ہوئی تو
غلام محمد صاحب گورنر جنرل تھے انہوں نے مجھے بارہا یقین دلایا کہ ان (وزیر صاحب)
سے قابل بہت ہی کم انسان ہو سکتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ صاحب پلندری (پونچھ)
تشریف لے گئے تو ان کے ساتھی اس وقت کے صدر آزاد کشمیر بھی تھے۔ پونچھ
کے عوام نے روایتی طور پر ان کا استقبال بڑی سرگرمی سے کیا اور جب انہوں
نے اپنی تقریر ڈاک بنگلے میں کھڑے ہو کر شروع کی تو لوگوں نے ایسے
نعرے لگائے کہ ان وزیر صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک معزز مہمان غش
کھا کر گر پڑے۔ وزیر صاحب کی تقریر کا موضوع ایک دم بدل گیا۔ ان کے گلے

میں یہ تقریر اس طرح پھنس گئی کہ اس کے بعد زائد کچھ نہ کہہ سکے۔ ان لوگوں سے پاکستان کے عوام نے یہ امید وابستہ کر رکھی تھی کہ یہ کشمیر فتح کر کے پاکستان کے ساتھ ملا دیں گے مگر دوسرے دن پاکستان کے پریس میں ان وزیر صاحب کی تقریر بڑے طمطراق سے چھپی تھی جس میں درج تھا کہ "کشمیر کو دشمن کے چنگل سے چھڑوانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جائے گا"

امورِ کشمیر کے وزراء

ان کے بعد ایک اور صاحب وزیر امورِ کشمیر کی حیثیت سے تشریف لائے ان صاحب کے ذاتی تجربہ زندگی کا یہ حال تھا کہ ان سے مل کر ایک صاحب علم اور ذی عقل انسان پریشان ہو جاتا تھا۔ کشمیر کے متعلق ان کا ذاتی علم یہ تھا کہ ان کے علم میں جھیل ڈل بھی ایک افسانوی معاملہ تھا حقیقی وجود ہی نہ تھا۔ ان صاحب کا ایک چکر ایک ماہ کے اندر کراچی سے راولپنڈی رہتا تھا۔ اس طرح کشمیر کے آزاد کرانے میں گویا وہ بہت بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کے افسروں نے ان کی خوشامد کر کے ان کا دماغ اس قدر خراب کر دیا تھا کہ واقعی وہ سکندر اعظم کے جانشین اپنے آپ کو سمجھنے لگے اور وہ یہ بھی سمجھنے لگے کہ واقعی وہ ایک بڑی فوج کے سپہ سالار بن کر کشمیر کو آزاد کر سکتے ہیں۔ کاش کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کو اتنی ہی سمجھ ہوتی کہ وہ کس کام کے اہل ہیں! اور جس کام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینے اسے آسانی سے سنبھال بھی سکتے۔

جب مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو یہ سیاست دان اپنی حفاظت کی تلاش میں اسطرح بلوں

میں گھس گئے کہ اس کے تصور سے انسان کو نفرت ہوتی ہے یہی لوگ تھے جو کشمیر کی فتح کرنے کے منصوبے اپنی میزوں پر بیٹھ کر بناتے تھے اور ہر ایک خود یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہی قائد اعظم کے جائز جانشین بن سکتے ہیں۔ ان غلط فہمیوں نے پاکستان کے سیاست دانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور سب سے بڑا نقصان اسی سے ملک کو ہوا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ایک ایسے دور کا آغاز ہو گیا جس کا حشر خطرناک ہوا۔ یہ ابتدا کراچی کی سرزمین سے ہوئی۔ کراچی کا ماحول ایک نئے ملک کی تعمیر کے لئے نہایت ہی غیر موزوں تھا مگر ملک کا دارالخلافہ کراچی قرار پایا اور وہیں دولت کی دوڑ شروع ہوئی۔ اس دوڑ کی پرورش کراچی کے ماحول میں خوب ہوئی۔ تجارت کے پرمٹ اور لائسنس حکومت سے حاصل ہو سکتے تھے اور حکومت کراچی میں موجود تھی۔ ان پرمٹوں کی قیمت ہزاروں روپوں سے لاکھوں روپوں تک بڑھ گئی تھی۔ سارے معاملات محض ٹیلی فون پر طے ہو جاتے تھے ان پرمٹوں اور دوسری تجارتی رعایتوں کی تقسیم اس تیزی کے ساتھ شروع ہوئی کہ اس کی انتہا پاکستان کی سلامتی اور بقا کے لئے خطرے کا باعث بنی۔

کراچی کے اس سازشی ماحول میں بیرونی ملکوں کے ایجنٹ تخریبی کاروائیوں میں مصروف کار تھے۔ رشوت۔ شراب خوری انسانیت سوز حرکات بدرجۂ اتم ترقی کر گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ تباہی ایک خطرناک انجام کی طرف لے جانے لگی۔ اس طوفان کے خلاف نہ کسی سے بغاوت ہو سکی اور نہ ہو سکتی تھی اور یہ طوفان پیدا کرنے والی ایسی طاقتیں تھیں جن پر قابو پانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کچھ سیاست دان ایسے تھے جن کو اس تباہی کا احساس تھا مگر وہ اس

قدر بے بس ہو گئے کہ یا انہوں نے ملازمت اختیار کر لی یا کنارہ کشی اختیار کر لی یا مجبور ہو کر اس دردناک منظر کا انجام دیکھنے لگے۔ سالہا سال میں نے اپنی آنکھوں سے ان دردناک حالات کا جائزہ لیا۔ اس کے خلاف احتجاج بھی کیا مگر اپنے آپ کو بھی اس مقابلے کے لئے تیار نہ کر سکا۔ یہی وہ کمی تھی جو میری طرح اور بھی لوگوں میں موجود تھی۔ یہی وجوہات تھے جن کی وجہ سے ان رجحانات کے خلاف کاروائی نہ ہو سکی۔ ایسے حالات کے خلاف کاروائی کے لئے بڑی ہمت، جرأت اور تنظیم کی ضرورت تھی۔ ایک بڑے طوفان کا مقابلہ تھا۔ ایک آدھی نحیف آواز اس کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔

۱۹۵۸ء اکتوبر کے فوجی انقلاب کے نتائج کا ابھی تک انتظار ہے۔ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس انقلاب کے یہ کارنامے ہیں:-

۱۔ زرعی ریفارم

۲۔ زرمبادلہ کے متعلق اقدام

۳۔ بلیک مارکیٹ کے خلاف اقدام

۴۔ ملک سے مال کی ناجائز برآمدگی کے خلاف اقدام

۵۔ ایجوکیشنل ریفارم

۶۔ قانون کے متعلق اصلاحات

گو ابتدا اچھی ہوئی تھی۔ فوجی نظام کے نام پر فوری طور پر مندرجہ بالا اصلاحات کی ابتدا ہوئی۔ یہ اقدام دفتری ہیر پھیر اور سرخ فیتہ سے بالاتر تھے۔ اس کے پیچھے چند وزیر اور خود صدر تھے۔ اس لئے ان کی تکمیل جلدی ہوتی رہی جو ایک خاص انجام تک پہنچائی جا سکتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ مایوسی کے آثار جلد ہی رونما ہونے لگے۔ حکومت

رشوت کی گرم بازاری پر قابو نہ پا سکی ۔ اشیا کی قیمتیں بڑھتی گئیں ۔ ان پر قابو حاصل نہ ہوا ۔ زرعی اصلاحات توقعات سے بہت ہی پیچھے رہ گئیں ۔

میں ۱۹۶۲ء میں صدر محمد ایوب خاں سے راولاکوٹ (آزاد کشمیر) میں ملا ۔ میں نے انہیں بڑے ادب سے عرض کیا کہ جناب رشوت کا بازار اب بھی گرم ہے ۔ اشیاء کی قیمتیں آسمان کی طرف جا رہی ہیں ۔ فرمانے لگے "اس کا علاج کوئی آسان نہیں ۔ مسلمانوں کی ساری قوم اخلاقی اقدار بھول چکی ہے ۔ یہی ہمارے اخلاقی انحطاط کا سبب ہے ۔" پھر مجھ سے استفسار کرنے لگے ۔ "تمہارے خیال میں اس کا کیا علاج ہے ؟" میں نے بڑے ادب سے کہا "صاحب میں تو سیاست دانوں کی فہرست کا آدمی ہوں ۔ میں اصلاح کرنے میں ناکام ہو کر کنارہ کش ہو گیا ہوں !" اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا ۔

اخلاق ۔ مذہب اور مادہ پرستی

اخلاقی طور پر دنیا کے انسان یقیناً گر رہے ہیں ۔ مادی طور پر دنیا حیرت انگیز ترقی کی طرف جا رہی ہے ۔ انسان اس وقت چاند تک مادی طور پر پہنچ چکا ہے صرف انسان کا ہی صرف اب چاند پر قدم رکھنا باقی رہ گیا ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے اگلے چند سالوں کے اندر اندر یہ ممکنات سے بدل کر حقیقت بن جائے ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہو گی چاند پر پہنچنے کے بعد کیا کیا ایجادات اور معلومات انسان کے دائرۂ علم میں آتی ہیں ۔ اس کی پیشین گوئی ممکن نہیں ہے مگر ہر انسان آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ اگر ایٹم کی جنگ نے انسانوں کو مکمل تباہ نہ کر دیا تو انسان اپنے سائنس کے

علوم میں ایسی ترقی کی جانب رہا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ــــــ میں اپنے بال بچوں میں بھی بیٹھ کر ہر وقت اپنی بیوی کو اس بات کا احساس دلاتا ہوں کہ ہم لوگ کس قدر حیرت انگیز ترقی کے دور میں پیدا ہوئے اور ہم کس قدر خوش قسمت لوگ ہیں کہ اس دور کی ترغیبات سے محظوظ ہوئے ہیں۔ مجھے اتنا ہی زندگی میں جاننا کافی ہوتا اگر میں ان علوم کے متعلق محض جان کر ہی مر جاتا۔ چہ جائیکہ میں خود ان معجزات سے مکمل لطف بھی اٹھا چکا ہوں۔

سائنس کے علوم نے کیا کیا نعمتیں لا کر ہمارے قدموں میں رکھ دی ہیں اور یہ دور کس قدر حسین اور روح پرور ہے! مانا کہ نہ صرف انفرادی طور پر ہی بلکہ قومی طور پر اور مجموعی طور پر انسان خود غرضی کی طرف بڑھتا گیا ہے لیکن جس قدر کہ ترقی میڈیکل سائنس نے کی ہے اور جس قدر کہ بین الاقوامی ادارے انسان کی بہتری کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کے لئے اس کی دل کی تسلی کے لئے بے بہا نعمت ہیں۔ کوئی بھی صاحبِ علم آدمی یہ حسرت لے کر مر نہیں سکتا کہ انسان محض وحشی ہے اور وحشت کے دور سے گزر رہا ہے۔

سماجی اور سیاسی طور پر بہر حال انسان نے اتنی ترقی نہیں کی ہے گو انسان نے اپنے سامنے بڑے بڑے اصول رکھے ہوئے ہیں جنہیں اپنائے پھرتا ہے گہری نظر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان بین الاقوامی اشتہاروں میں منافقت بہت زیادہ ہے اور اخلاص بہت کم ہے۔ آج بھی دنیا کی بڑی بڑی قوموں میں اخلاص ہوتا یا انسانی ہمدردی کا صحیح اور گہرا جذبہ موجود ہوتا تو جو تاریک قوتیں

تباہی کی طرف لامحالہ لے جارہی ہیں۔ ان پر کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔ انسان نے جو مکمل کامیابی قدرتی وسائل کے کنٹرول پر حاصل کی ہے اس سے انسانیت کی خدمت کے لئے بے بہا فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا —— چاروں طرف اپنی نظر دوڑائیے تو ایسے کسی شخص سے ساری انسانیت دوچار نہیں ہوتی جس کی تمام تر قوت اسی اسی مقصد کے حصول کے لئے کام کر رہی ہو۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا کے بڑے بڑے لوگ اور بڑی بڑی قومیں ایک مہلک اور خطرناک جنگ کی تیاری کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ یہ پہلو بے حد مایوس کن ہے۔

مذہب سے دنیا پہلو بچانا چاہتی ہے۔ اعلانیہ مذہب کی مخالفت کوئی نہیں کرتا مگر مذہب کے دلدادہ کم لوگ رہتے جاتے ہیں۔ خصوصاً مغربی ممالک میں لوگ مذہب پر عام گفتگو بھی فرسودہ معاملہ خیال کرتے ہیں۔ روحانیت تو اس وقت انسانی معاملوں میں کارگر ہے ہی نہیں۔ اس وجہ سے ایسی قدریں جن کے بل بوتے پر انسانیت پنپ سکتی تھی ختم ہو رہی ہیں۔ مذہب کے متعلق گفتگو اخلاقیات یا روحانیت کے متعلق مقالے اور سیاسی تقاریر محض زیب داستان کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ سو فی صد ریاکاری ہوتی ہے۔ اس میں منافقت کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ خود اہل مذہب نے مذہب کو محض استعمال کیا ہے یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی کے اوپر والے لوگ مذہب کے نام سے بھی گھبراتے ہیں۔ مذہب کے لئے کام کرنے والے لوگ خود بھی خود غرض اور تنگ دل واقع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ محض بہشت میں ان کو ہی جگہ ملنی چاہیئے۔ یہ محض تنگ دلی ہے اس خیال کا اظہار وہ واضح طور پر نہیں کرتے مگر ان کے ہر عمل کا پس منظر

یہ نظریہ ہوتا ہے ۔ بہرحال یہ خود غرضی عین انسانی فطرت کے مطابق ہے ۔ اہل دین اللہ کی خوشنودی کے لئے سو قسم کی ریاضت کرتے ہیں تو بے عمل کو بھی اگر جنت نصیب ہو جائے تو بے انصافی کی بات ضرور ہے مگر اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ اہل دین خصوصاً علماء لوگ ہر معاملہ محض اللہ تک چھوڑنے کی بجائے خود معاملہ اپنے ہاتھ میں جو لینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس سے سارا معاملہ خراب ہوتا ہے ۔ موجودہ دور کے ایک اعلیٰ طبقے والے صاحب علم انسان کے لئے یہ تنگ نظری ایک قابل نفرت معاملہ بن جاتا ہے اور اس تنگ نظری کے باعث اہل دین سے ہی نفرت کرنے نہیں لگتا ہے بلکہ سارے مذہبی معاملات سے دور کھچ کر رہ جاتا ہے ۔ یہی بہتر سمجھتا ہے کہ دین کے معاملے میں دخل ہی نہ دیا جائے ۔ دینی بحث سے کنارہ کش ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ کج بحثی اور تنگ نظری کے لئے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہتی ۔

وہ خوبیاں یا خصائل جو خدا پر بھروسہ رکھنے سے یا ایک غیر فانی قوت (خدا) پر یقین سے پیدا ہو سکتی تھیں وہ پیدا ہی نہیں ہوتیں ۔ بلکہ اگر موجود بھی تھیں تو اپنی موت آہستہ آہستہ مر جاتی ہیں ۔ اگر سارے انسانوں کا ماحول ایسا بنتا گیا تو ساری انسانیت ایک دن بغیر یقین کے رہ جائے گی ۔ محض مادی دنیا پر یقین سے انسان کسی بلند مقام تک پہنچ نہیں سکتا ۔ انسان کی ترقی کی بلندی بہرحال روحانی ترقی سے پرکھی جا سکتی ہے ۔ محض دنیا کا بڑے سا بڑا ڈیم تعمیر کرنا انسانی ترقی کا آخری معیار ٹھہرایا نہیں جا سکتا ۔ ایسا کرنے سے انسانیت کو بڑا نقصان پہنچے گا ۔ جدید قدروں کی بنیاد پر ایک نئی دنیا بنائی جا سکتی ہے ۔

حصّہ پنجم

۱۳: اس گناہ پہ مجھے مارا کہ گناہگار نہ تھا

۱۹۵۹ء کے وسط کے لگ بھگ مجھے وزارتِ امورِ کشمیر کے سیکرٹری صاحب کا کراچی سے ٹیلی فون پر پیغام ملا کہ صدر مجھ سے خوش نہیں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ میں استعفیٰ دے دوں۔ ویسے بھی نفاذ مارشل لاء کے ساتھ ہی میں نے صدر اسکندر مرزا صاحب سے پہلے ہی چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر استعفیٰ دینے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ ان کا جوابی پیغام مجھے یہ ملا تھا کہ مجھے اپنی عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ صدر ایوب خاں جب اسکندر مرزا سے چھٹکارا پا سکے تو ان کی خدمت میں راولپنڈی میں ساری آزاد حکومت حاضر ہوئی۔ انہوں نے بھی اطمینان کا یقین دلایا۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ پہلی ناراضگی جو صدر ایوب خاں صاحب کو مجھ سے ہوئی وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ سے غیر حاضری سے ہوئی، جس مجلس کے وہ صدر تھے میں اس میں حاضر نہ ہو سکا۔ حاضر نہ ہونے کی کوئی وجہ

نہ تھی۔ میں نے یہ ضروری نہ سمجھا کہ میرا وہاں حاضر ہونا اخلاقی طور پر بہت ضروری تھا میری خالی جگہ دیکھ کر غالباً انہوں نے دریافت فرمایا اور یہ بتائے جانے پر کہ میری (یعنی صدر آزاد کشمیر) کی جگہ ہے۔ ان کے ماتھے پر شکن کے خفیف سے سے نشانات بن کر جلدی ہی مفقود ہو گئے، مجھے لاہور میں ہی اس سے آگاہ کر دیا گیا تھا مگر میں نے اس سارے واقعہ کو اہمیت ہی نہ دی۔

اسی طرح مجھے یہ بتایا گیا کہ راولپنڈی میں ہونے کی صورت میں صدر پاکستان کی الوداع کے لئے ہوائی اڈے پر حاضر ہونا ضروری ہے۔ ایک بار دیر سے پہنچا۔ اس سے صاحب ناراض ہوئے ہوں گے۔ ان معاملات کے علاوہ ایسی کوئی بات کم از کم میرے نوٹس میں نہیں لائی گئی جس کی بنا پر صدر پاکستان مجھ سے ناراض ہو سکتے ہوں۔ جب مجھے سیکرٹری وزارت امورِ کشمیر کا پیغام بلائے ناگہانی کی طرح صادر ہوا میں نے بڑی کوشش کی صدر پاکستان سے ملاقات نصیب ہو سکے۔ مقصد کہ اللہ شاہد ہے اپنی صدارت کو بچانے کا نہیں تھا۔ اس کی امید کم رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر اس کے لئے میں پہلے سے تیار تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آخر گستاخی کون سی سرزد ہوئی ہے مگر افسوس کہ ان کے افسروں نے انہیں اس ملاقات کے لئے مشورہ نہ دیا۔

بعینہٖ یہی بات خورشید صاحب کے ساتھ بھی ۱۹۶۴ء ہوئی۔ خورشید صاحب نے بھی استعفیٰ دینے سے قبل جان توڑ کوشش کی کہ صدر پاکستان سے ملاقات نصیب ہو۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ یہ بات اصول کی ہے کہ ایک ادنیٰ ملازم کو بھی ڈسمس کرتے وقت اس کو آخری لفظ کہنے کا موقعہ ملتا ہے۔ یا کم از کم

یہ انسانیت کا آخری تقاضا ہے کہ الوداع ایک باعزت طریقہ سے کی جائے۔ اختلاف ہونے کی صورت میں بھی انسان مناسب خیال کرتے ہیں کہ مخالف کے ساتھ مہذب اور مؤدّب برتاؤ اختیار کیا جائے۔ اس میں کوئی ہرج واقع نہیں ہو سکتا بلکہ الوداع ہونے والے کا غم کم ہوتا ہے۔ الوداع کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ انصاف کے بلند اصول بھی ایسے سلوک کا تقاضا کرتے ہیں کہ جس شخص کو آپ سزا دے رہے ہیں اس کو آخری موقعہ اپنی بات سنانے کا دیا جائے۔ افسوس کہ آزاد کشمیر کے صدر کو ڈسمس کرتے وقت یہ بھی مناسب خیال نہیں کیا گیا۔ یہ کشمیر اور آزاد کشمیر کی سیاست کا کس قدر دردناک پہلو ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ . . .

بڑے سے بڑے صدر کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ اسے اپنی نرم کرسی کو ایک دن الوداع کہنا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر اقتدار والے حکمران کو یہ بات ہر لمحہ سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ فرانس کے ایک دور کے کسی مشہور وزیر اعظم کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ مجھے یہ بات ہر وقت سامنے رہتی ہے کہ میں زندگی میں سائیکل پر ہر روز صبح سردی میں ڈبل روٹی تقسیم کرنے والا معمولی ملازم تھا اور جب اپنی موجودہ بلندی کو دیکھتا ہوں تو فوراً اپنی حیثیت یاد آنے پر ذہن میں ایک صحیح توازن پیدا ہوتا ہے اگر فرانس کے وزیر اعظم کے متعلق یہ بات صحیح ہے تو کس قدر اچھی بات ہے جو ہم سب کے لئے سبق آموز بھی ہے۔ ویسے ہمارا دین بھی ایسے کردار کی تلقین

کرتا ہے ۔ ذاتی طور پر اپنا ذہنی توازن بھی ایسے ذہنی رویہ سے قائم رہ سکتا ہے ۔

ایسے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن کے دہرانے سے کیا حاصل، تلخی کے سوا ایسے واقعات سے کچھ برآمد نہیں ہو سکتا ۔ انہیں واقعات کی وجہ سے کشمیر کی سیاسیات میں جنگ بندی لائن کے ہر دو جانب مایوسی اور ذہنی انتشار پھیلا ہے ۔ وزارت امور کشمیر نے جو راولپنڈی میں انسانوں کی سودا بازی کا سلسلہ شروع کیا اس سے بھی آزادی کشمیر کی تحریک کا بلند پہلو واضح طور پر سامنے نہ رہا ۔ حقیقت زیادہ سبق آموز ہے محض تخیل انسانوں کے خیالات کچھ عرصہ کے لئے ضرور بلند آسمانوں کی سیر کراتا ہے مگر جلد ہی دنیا کی حقیقی زندگی اس کو اپنی جانب کھینچ کر زمین پر دھڑام سے دے مارتی ہے ۔

کشمیر کی سیاسیات کے کئی پہلو تھے جن سے میں ہی نہیں اور بھی دوست مایوس ہوئے ۔ میں نے ۱۹۶۱ء کے بعد ملکی سیاسیات میں دخل دینا ارادۃً ترک کر دیا ۔ ۱۹۶۴ء تک نہایت ہی اطمینان سے پرائیویٹ زندگی بسر کرنے لگا ۔ مقامی اور ہفتہ وار اخبار جو کشمیر کی سیاسیات پر تبصرہ کرتے ہیں انہیں پڑھنا بند کر دیا ۔ اس سے بھی ایک گونہ سکون حاصل ہوا اپنے معمولی کاروبار اور اپنی ذاتی تعلیم کے کاموں میں مصروف ہو گیا ۔ اپنے بچوں کے ساتھ کھیل کود کے معصوم مشاغل میرے لئے لطف بخش ثابت ہونے لگے ۔ محض ایک کنارے پر کھڑے ہو کر سماجی حالات کا جائزہ بہ حیثیت خود ایک دلچسپ شغل ہے اس سے لطف اندوزی انسانی ذہنی ارتقا کے لئے بے حد مفید ہے ۔ اس دور میں اقتصادی طور پر مشکل ایام نے بے حد پریشان کیا راولپنڈی میں وکالت ترک کر دی ۔ چند کم ظرف مجسٹریٹوں نے ایسا کرنے پر مجبور کیا ۔ ان کا شکو

اتنا انسانیت سوز تھا کہ ان عدالتوں میں وکالت کا پیشہ ایک رات کی سوچ کے بعد ترک کر دیا جو بھی اور شغل اختیار کیا اس میں ناکامی ہوئی اس سے بھی کافی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ذاتی معاملات میں چند ایسے واقعات پیش آئے کہ تلخی کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ گمنام درخواستیں حکومت پاکستان تک پہنچائی گئیں۔ جن سے مجھے پریشان کیا گیا جو میرے جائز حقوق تھے ان سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی گئی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی سوچی سمجھی سازش تھی۔

مارشل لاء میں میری گرفتاری

مارشل لاء کے تحت نومبر ۱۹۵۹ء میں میری گرفتاری ہوئی۔ مجھے علم ہے کہ چند افسروں نے میرے سیاسی حریفوں سے مل کر عمل میں لائی تھی۔ یہ واقعہ بھی کسی قدر دلچسپی سے خالی نہیں۔ کسی آدمی نے آزاد کشمیر پولیس کے انسپکٹر جنرل کو خط لکھا اس خط میں پولیس کے اس افسر کو اطلاع دی گئی تھی کہ کوئی ماتحت تمہارے خلاف غلط کاروائی میں مصروف ہے۔ اس خط کو مارشل لاء کے ایک ضابطے کی خلاف ورزی ٹھہرائی گئی۔ وزارت امور کشمیر کے چند افسروں نے کچھ میرے مخالف لیڈروں سے مل کر میری گرفتاری کے احکام صدر پاکستان سے حاصل کئے اور ایک رات میرے سونے سے قبل ایک پولیس کے افسر تشریف لائے معمولی سی بحث کے بعد میرے سونے کے کپڑوں میں ہی گرفتار کر کے تھانہ میں لے گئے۔ کپڑے بدلنے کی فراغت بخشنی مناسب نہ سمجھی۔ پہلے پانچ منٹ میں پریشان ہوا۔ باغ سے اسی دن میں نے شاخ تراشی کرائی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ اسی جرم کی پاداش میں

مارشل لاء کے ضابطے حرکت میں آ گئے! پھر اخلاقی طور پر اپنے ضمیر کو صاف پاتا تھا اور ایسا کوئی جرم نہیں تھا جس کی وجہ سے انسان پشیمان ہو۔

مجھے تھانے میں پہنچا کر ان افسر صاحب نے دو دستاویزات میرے سامنے رکھ دیں۔ ایک وہ خط تھا جو کسی دوست کو میں نے لکھا تھا۔ میں نے چند لمحوں میں ان صاحب کو عرض کیا کہ ایک خط میرا ہے۔ دوسرا میرا نہیں ہے۔ میں نے اس قدر دریافت کی بھی جرأت کی کہ کیا اسی خط کی بنا پر آپ نے میری گرفتاری کی زحمت کی ہے؟ وہ حیران سے ہو کر میری جانب دیکھنے لگے۔ آنکھوں میں استفسار تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کیا یہ دستاویز گرفتاری کا جواز نہیں ہو سکتی! انھوں نے میرا بیان قلمبند فرمایا۔ یہ دریافت کیا کہ یہ کیس کس نے آپ کے خلاف بنایا ہے۔ میں نے ان افسروں کے نام ان سے عرض کر دیے جن کا ہاتھ اس معاملہ میں ہو سکتا تھا۔ اپنے سیاسی مخالفوں کی جانب بھی اشارہ کر دیا۔

جعلی خط

یہ خط لاہور میں لکھا گیا تھا اور راولپنڈی جا کر ڈاک میں ڈالا گیا۔ میرے ایک رشتہ دار معمولی پولیس کے ملازم کو لالچ دے کر ایسے کام کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ ایک دوسرے رشتہ دار سے یہ ذلیل دستاویز تیار کروائی گئی۔ ثابت یہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اس دستاویز کا اصل مصنف میں ہوں۔ کیونکہ اس دستاویز کی تحریر میری تحریر سے مشابہ ہے اور یہ جرم پاکستان میں مارشل لاء کے سنگین ضابطوں کی خلاف ورزی تھا۔ جن کی سزا چودہ سال قید سخت سے کم نہ تھی۔ اس کارروائی

پر صدر حکومت پاکستان کے دستخط لے لئے گئے تھے۔ میں نے یہ دستاویز دیکھتے ہی پولیس کے ان صاحب سے نہایت ہی معصومانہ انداز میں (اور کوئی انداز ہو سکتا بھی نہیں تھا) دریافت کیا کہ کیا آپ نے کسی قانون کے ماہر سے اس معاملہ میں مشورہ بھی لیا ہے۔ یا قانون کے الف۔ب جاننے والے کو بھی یہ علم ہو جانا لابدی تھا کہ جو خط مظفر آباد میں انسپکٹر جنرل نے کھول کر پڑھا۔ اس کے بعد ان کے کوٹ کی جیب میں قید ہوا۔ ایسے خط کے اثرات پاکستان کی مملکت تک کس طرح آ گئے! کس طرح آ کر اس خط نے پاکستان کی پبلک کو ان پولیس کے افسر صاحب کے خلاف مشتعل کیا جس کی وجہ سے مارشل لاء کا یہ ضابطہ حرکت میں آگیا۔ ظاہر ہے کہ کسی دانا آدمی نے اس معاملہ پر غور نہ کیا تھا۔ جس سازش میں اچھے بڑے افسروں کا ہاتھ تھا۔ ان افسروں کے ذہن سے یہ معمولی تفصیل اتر گئی تھی!

مارشل لاء کے قانونی مشیروں نے فوراً یہ مشورہ دیا کہ پاکستان میں کوئی جرم مارشل لاء کے ضابطوں کے تحت سرزد نہیں ہوا۔ یہ بات میرے لئے قابلِ فخر ہے کہ قانونی مشورہ دینے والے یہ نیچے کے چھوٹے چھوٹے افسر تھے۔ ان افسروں نے اپنی رائے قائم کر رکھی۔ اپنی صحیح بات پر اڑے رہے ان پر بہت زور ڈالا گیا یہ داد دینے کی بات ہے کہ ایسے مشورہ کو ان افسروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جب ان کی رائے کے ساتھ ان کے بڑے افسر بھی متفق ہو گئے تو کمانڈر انچیف صاحب نے صدر پاکستان کو ٹیلی فون پر معاملہ پیش کیا اور کہا کہ مارشل لاء

کے تحت کوئی بھی جرم سرزد نہیں ہوا۔ اس پر صدر پاکستان نے فوراً حکم دے دیا کہ مجھے بلا تاخیر رہا کیا جائے۔ ان احکام کے باوجود چار دن تک میرے مخالف لوگوں نے یہ احکام روک رکھے۔

میرا ضمیر صاف تھا

جیل میں جا کر پہلے دن کی معمولی کوفت کے بعد میری ساری پریشانی ختم ہو گئی۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جھوٹ زیادہ عرصہ پنپ نہ سکے گا اس سے بھی تسلی تھی کہ میرے دوست میرے لئے مصروف تھے۔ سارے میرے وکلاء دوست ایک جماعت کی طرح کھڑے ہو گئے۔ زیادہ پریشانی اور مصیبت میری بیوی کو برداشت کرنا پڑی۔ جس ہمت اور حوصلے سے میری بیوی نے اس مصیبت کا مقابلہ کیا اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ ساری مصیبت کو بے حد دلیری اور جرأت سے اپنے سر پر لیا۔ متعلقین کو ملنے کی کوشش کی۔ صرف جنرل محمد اعظم خاں (جو اس وقت صدر کے خصوصی اختیار کے حامل تھے) نے ملنے سے انکار کیا۔ وہ ڈرپوک واقع ہوئے ہیں۔ محمد اعظم خاں ان لوگوں میں سے ہیں جن سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ اس بات کا صدمہ میری بیوی کو آج تک ہے۔ اوروں کو معاف کرنے کو میری بیوی تیار ہوئیں مگر اعظم خاں کے سلسلہ میں کبھی رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ ان لوگوں کا غالباً یہ خیال تھا کہ مارشل لاء ایک طوفان ہے۔ اگر اس طوفان کے کسی ضابطے کی مخالفت مجھ سے ہوئی ہے تو میرے لئے پھانسی یقینی ہے۔ جتنے منہ اتنی

باتیں لوگوں نے کہنی شروع کیں۔ اور کیا کیا نہیں اٹھائیس دن کی میعاد میں میرے متعلق پھیلا یا گیا۔ جب میں اٹھائیس دن کی مختصر سی میعاد کے بعد باعزت اپنے گھر آگیا تو کہنے والے بے حد نادم ہوئے۔

میرے دوستوں نے میرا اچھی طرح ساتھ دیا۔ ایم اے ظلا صاحب خصوصًا اور دوسرے دوستوں نے نہایت جرأت مندی اور نیک نیتی سے میری طرف سے جنگ لڑی۔ ان کو مارشل لاء کے خوف نے ہرگز مرعوب نہ کیا۔ ظُلا صاحب میرے ان دوستوں میں سے ہیں، جنھوں نے مہینوں پلندری کے لوگوں کے مقدمات کے سلسلہ میں طوفانی زحمتیں اٹھائیں پیدل چل کر ہم نے ان لوگوں کی وکالت کی جن کو ۱۹۵۵ء کے بدقسمت واقعات کی وجہ سے حکومت نے باندھ لیا۔ ان کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں۔ سامان بے رحمی سے گھروں سے لوٹ لئے گئے۔ پھر رسیوں سے باندھ کر ان لوگوں کو عدالتوں میں پیش کیا گیا۔ اس کا مقصد ان لوگوں کو بے عزت کرنے کا تھا۔ ایک انتقام اس کا پس منظر تھا۔ میرے دوست ایم اے ظلاء صاحب جو اس وقت لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کرتے ہیں۔ اور باقی رفقاء نے میرا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اس ہمدردی کی وجہ سے پونچھ کے لوگ پاکستان سے کسی قدر بھی متنفر نہ ہوئے تھے۔ گو کہ ان پر اس قدر مظالم ڈھائے گئے تھے۔ لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ عوام الناس پاکستان کا ان معاملوں میں دخل نہیں ہے۔ یہ محض حکومت کے صاحب اقتدار اور صاحب پالیسی لوگوں کی کرم فرمایاں تھیں۔ یہ ایک گئی گزری کہانی ہے۔ اس میں تلخی کا اب کوئی پہلو نہیں رہا۔ البتہ مجھے ایک بات کی حسرت

ضرور ہی ہیں نے اپنے والے معاملہ میں جیل سے رہا ہو کر دو تین درخواستیں جناب صدر پاکستان کی خدمت میں ارسال کیں۔ ان درخواستوں میں مکمل انکوائری کی استدعا کی۔ جو افسر اس سازش کے ذمہ دار تھے ان کے نام بتائے اور وجوہات کی تفصیل بتائی کہ یہ افسر میرے خلاف تھے۔ صدر پاکستان نے ان درخواستوں پر کوئی توجہ نہ بخشی ہیں یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہوں کہ صدر صاحب اس بات کو معمولی خیال فرماتے ہیں کہ کسی بے گناہ و باعزت انسان کو جیل کی کوٹھڑیوں میں چند یوم کے لئے بند کیا جائے۔ خیر یہ ان کا خیال ہوگا! انہوں نے ابھی تک حزب مخالف میں رہ کر کام نہیں کیا جب وہ کریں گے تو ان کو بھی غالباً ایسے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جیل میں

اس ساری گھناؤنی تفصیل کا ایک اچھا پہلو بھی تھا۔ اسے نظر انداز کرنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔ مجھے پہلی رات تھانہ چھاؤنی راولپنڈی میں گزارنی پڑی جہاں اپنے سونے والے کپڑوں میں کار میں بٹھا کر لیجایا گیا تھا۔ چند منٹوں کے اندر اندر تھانے کے تھانیدار صاحب نے میرے گھر سے بستر وغیرہ اور باقی ضروری سامان سب منگوا کر دیا۔ کھانے کے متعلق نہایت ہی اخلاق کے ساتھ دریافت کیا۔ صبح تھانے دار صاحب خود جا کر میرے گھر سے میرے نہانے کا سامان لائے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ میرے سلیپر نہیں لائے گئے تو خود سائیکل پر جا کر میرے سلیپر لائے۔ ایسے سلوک نے میری طبیعت کو بے حد اطمینان ہوا۔

ایسے تھانیدار ہمارے ملک پاکستان میں نایاب ہیں۔

جب مجھے جیل لیجایا گیا تو وہاں کے سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل موجود نہ تھے۔ ان کے نائب صاحب تھے۔ جو فرعون مزاجی میں کسی سے کچھ کم نہ تھے۔ اپنی حکومت کا اچھی طرح مظاہرہ کرنے لگے غالباً ان کا یہ خیال تھا میں غصے میں آؤں گا۔ ان کے ساتھ بحث مباحثہ پر اتروں گا۔ پھر وہ اپنی خوب صورت طرز تقریر کا مظاہرہ فرماسکیں گے اور جیل کے قوانین پر اظہار خیال فرمادیں گے۔ ان کی مایوسی کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے ان کی ساری بات کا نوٹس ہی نہ لیا۔ آرام سے بیٹھ کر ایک کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن چند ایام میں اصل سپرنٹنڈنٹ جیل تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میں پاکستان میں ان کا مہمان ہوں۔ مجھے ہر سہولت حاصل ہوئی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لکھنے کے لئے ہر سامان گھر سے مہیا ہونے کی اجازت مل گئی (چنانچہ اس کتاب کا بیشتر حصہ ان اٹھائیس ایام کی تصنیف ہے) جو بھی مجھے ملنا چاہیئے مل سکتا تھا۔ وقت کی بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ ان دو افسروں کے اس قابل صد ستائش رویئے نے میرے دل و دماغ پر بے حد اثر کیا۔ ان کے حسن سلوک سے میں نے زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش سبق سیکھا۔ غالباً جیل کے سٹاف اور پولیس کے سٹاف کے افسروں سے ایسے حسن سلوک کی توقع کم ہی آدمیوں کو ہو سکتی ہے۔ یہ بات میرے لئے کس قدر تسلی اور تسکین کا باعث ہے۔ ان افسروں نے محض اپنا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں میری شخصیت کے قائل ہیں اور دلی طور پر میری عزت کرتے ہیں۔ میں زندگی بھر اُن

لوگوں کا شکر گزار ہو گیا۔ جب میں جیل سے فارغ ہو کر باہر آیا۔ میرا وزن پانچ پاؤنڈ بڑھ چکا تھا۔ جیل میں اٹھائیس یوم ایک بے فکری کی زندگی نصیب ہوئی تھی۔ جتنی ہی میری بے فکری تھی اس قدر میرے قبیلہ اور رشتہ داروں اور دوستوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی طرح کئی دوستوں کی ہمدردی تھا۔ اسی طرح کئی دوستوں کی ہمدردی اور دوسروں کی جھوٹی دوستی کا پہلی دفعہ صحیح علم ہوا۔ یہ بھی ایک اچھا سبق آموز پہلو تھا۔ صحیح دوست صرف مصیبت کے دور میں جانے جا سکتے ہیں۔ اقتدار کے دور کے دوستوں پر کبھی بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جو کہ اقتدار کے دوستوں کو دوست جانتے ہوں ان کو بہت جلد مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صحیح اخلاص کا مظاہرہ ایسی پریشانی کے حالات میں ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تو فارسی والوں نے کہا ہے۔

؎ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

زندگی ـــ ہر دم جواں

جیل جانے کے بعد میری زندگی میں کوئی بات واقع نہ ہوئی۔ میں محض معمول کی زندگی امن وسکون سے بسر کرنے لگا۔ ۱۹۶۴ء کے اوائل میں میں اپنے مکان کی تعمیر میں بے حد مصروف تھا۔ مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں قرض لے کر بے حد پریشان تھا۔ ایک شام میں جلدی ہی کھانا کھا کر بستر پہ لمبا پڑ گیا۔ باہر سے ڈاکٹر رحمان صاحب کی آواز سنائی دی۔ ڈاکٹر رحمن وزارت

امور کشمیر کے ڈپٹی سیکرٹری تھے ۔میرے ساتھ ولایت میں دوران تعلیم پڑھا کرتے تھے ۔ دوست بھی تھے ۔ ڈاکٹر رحمٰن بے حد خلیق اور حلیم قسم کے انسان ہیں انہیں ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے پسند کئے بغیر آپ نہیں رہ سکتے ۔ڈاکٹر صاحب فوراً میرے کمرے میں تشریف لائے ۔ آتے ہی انہوں نے مجھے یہ حکم سنایا کہ حکومت پاکستان کی یہ خواہش ہے کہ میں کشمیر کے سلسلہ میں بیرونی ملکوں کا دورہ کروں ۔یہ قومی خدمت ہے ۔اس طرح میں حکومت کے نزدیک بھی آجاؤں گا۔ساتھ یہ حکم بھی سنایا کہ اگر میں بات نہ مان سکوں تو حکومت مجھ سے خفا ضرور ہوگی ۔

میں نے ان سے کہا کہ حکومت مجھ سے راضی کب ہوئی تھی ۔کیا حکومت نے ہر کشمیری لیڈر کو ذلیل کرنے کی کوشش نہ کی تھی ۔کشمیر کے کاذ کے نام پر حکومت نے اپنی پبلسٹی تو کروائی تھی مگر اہلِ کشمیر کے ساتھ وزارتِ امورِ کشمیر میں کیا سلوک ہوتا ہے ؟ کشمیری کے نام سے وزارتِ امورِ کشمیر کے افسران ناک چڑھا کر آسمان تک لے جاتے ہیں ؛ لہٰذا میں نے ان سے کہا کہ مجھے سوچنے کا موقعہ دیں اور دوسرے دن میں نے ٹیلی فون اپنی رضامندی کا اظہار کیا ۔ ساتھ ہی یہ کہا میر واعظ صاحب کو کشمیر کے ایک وفد کا لیڈر بنایا لیا ہے مگر مجھے دوسرے وفد کا صرف ممبر رکھا گیا ہے ۔میر واعظ صاحب میرے تحت وزیر رہ چکے ہیں ۔مگر ایسی باتیں حکومت پاکستان کے افسر کب زیرِ غور لاتے ہیں ۔ ان کو اپنے مقصد کے حصول کی تگ و دو ہوتی ہے ۔اصول یا اصول کی باتیں مدِ فضول کی طرح سمجھی جاتی ہیں ۔ چنانچہ میں نے اس کی

تفصیل پہلے بھی بیان کی ہے کہ آزاد کشمیر کی صدارت و وزارت کی تشکیل میں کبھی بھی کسی اصول سے کام نہ لیا گیا۔ آئینی پابندیوں کو بے دردی سے پاؤں تلے روندا جاتا رہا۔ میں نے ان افسران کو بارہا اس معاملہ پر قائل کرنے کی بیسود کوشش کی کہ ایک شخصیت کے آنے اور دوسرے کے جانے سے کوئی بڑی بات نہیں واقع ہوتی۔ متواتر ۲۰ سال کے عرصہ میں بے اصول کا مظاہرہ ہونا کشمیر کے کاز کے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہُوا ہے۔ اگر حکومت کے صاحبِ پالیسی لوگ شروع سے ہی آزاد کشمیر کے لیڈران کو اعتماد میں لے کر اخلاص سے کام کرتے۔ تو اپنی جگہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کشمیر میں آج اس سے کہیں بہتر نتائج برآمد ہوئے ہوتے۔ ساری قوم کو ایسی تنگ نظری اور تنگ دلی کے ہولناک نتائج سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ یہ کس قدر بدبختی کا مقام ہے! یہاں کسی خاص افسر کا نام لینا بے انصافی ہوگی۔ تنگ نظری اور تنگ دلی کی پالیسی ۱۹۴۷ء میں ہی تنازعہ کشمیر سے چلی آرہی ہے۔ ہر نئی حکومت نے ایک ہی پالیسی کو اپنایا۔ اس میں کوئی نئی بات لانے کی کوشش نہ کی گئی نہ ہی اس مسئلہ میں ایک انقلابی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ غالباً کئی دوست اس میں میرے ساتھ اتفاق نہ کریں مگر اپنی جگہ بات وزن رکھتی ہے۔ حکومت پاکستان کے صاحبِ اقتدار لوگ کشمیر کی تحریک سے خود بھی ہراساں رہتے تھے۔ جب مرحوم لیاقت علی خاں ۱۹۴۹ء کے اوائل میں تراڑکھل (آزاد کشمیر) تشریف لے گئے تو وہاں عوام اور آزاد فوجوں کی تنظیم سے خوش ہونے کی بجائے پریشان ہوئے

راولپنڈی آکر انہوں نے دوسرے دن مسلم لیگ والوں کی ایک نجی میٹنگ میں فرمایا کہ یہ پہاڑ والے تم لوگوں پر چھا جائیں گے۔ یہ بات مجھے کھوکھر صاحب مرحوم چوہان سپورٹس راولپنڈی والے نے خود سنائی۔ ساتھ ہی مجھے متنبہ کیا کہ میری صدارت کو جلدی ہی خطرہ لاحق ہے اور ایسے ہی ہوا۔ دروغ برگردن راوی۔

حکومت پاکستان کے مقتدر لوگوں کے دلوں میں یہ خدشہ بھی پلتا رہا کہ آزاد کشمیر کے انقلاب کے لپیٹ میں پاکستان نہ آجائے۔ اس پہلو کو مدنظر رکھ کر یہ اس پالیسی پر گامزن رہی کہ آزاد حکومت کے صدروں کو بدلتے رہنا چاہیئے تاکہ کسی ایک صدر کو مضبوطی کا کم موقعہ ملے۔ چنانچہ آپ آج کل آزاد کشمیر کے درجنوں سابق صدروں سے ملاقات فرما سکتے ہیں۔ جن میں کئی ایسے بھی ہیں جو محض اپنے دستخط ہی صحیح طور پر فرما سکتے ہیں۔ دل لگتی بات تو یہ ہے کہ ایک صدر صحیح طور پر انگریزی میں اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے۔ اسی چکر میں آزاد کشمیر میں وزراء درجنوں کی تعداد میں بنے اور ہر دوسرے سال بحران کا شکار ہو گئے اب آزاد کشمیر میں کئی درجن سابق وزیر صاحبان زمین کو ناپتے پھرتے ہیں۔ ان کی پہلی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ نئی حیثیت کے وہ اہل کبھی نہ تھے۔ ان کی زندگیاں ایک بحران و طوفان کی نذر ہو گئیں اور یہ بات تو ملک پاکستان میں بھی ایسی ہی ہوئی ہے جبکہ پاکستان میں تو سابق وزیروں کی تعداد سینکڑوں ہے درجنوں نہیں!

کشمیر۔ شہر بہ شہر ملک بہ ملک

جو حکمران یا افسران ایسی پالیسیاں وضع کرنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے ملک کی خاص خدمت سرانجام نہیں دی۔ صحیح نظریہ صحیح نکتہ نگاہ ان معاملات پر صرف مستقبل کا تاریخ دان ہی پیش کر سکتا ہے۔ یہ باتیں میں محض اس لئے کہتا ہوں کہ شاید صاحبِ اقتدار لوگ کسی دن معاملہ کی صحیح تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اہل کشمیر کو اپنے مکمل اعتماد میں لیں۔ وہاں کے عوام کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوں وہاں کی زبین کی حرص عمل سے فوراً حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ دل نیک نیتی اور اخلاق سے بھرپور ہو جائیں اور الجزائر کی طرح وہاں کے عوام کی امداد ہو۔ وہاں کے عوام صحیح قیادت کے تحت اپنے ملک کی آزادی اور عزت کے لئے جانوں کی قربانیاں پیش کریں۔ ان قربانیوں سے کشمیر کی تاریخ رقم ہو۔ تب ہی کشمیر آزاد ہو کر ملک پاکستان کا ایک صحیح جزو ہو گا۔ پاکستان کا حصہ ہونے کا صحیح حق کشمیر کو حاصل ہو گا۔ اسی قسم کے جذبات لے کر میں ایک نئے ارادے سے سرشار ہو کر مارچ ۱۹۶۲ء میں کراچی سے ہوائی جہاز پر افریقہ کے دورے کے لیے روانہ ہوا۔ اپنے بیوی بچوں کو پریشان اور بے بسی کی حالت میں چھوڑا۔ کراچی سے روانگی سے قبل ایک دوست سے کچھ رقم قرضے کی درخواست کی۔ جو انھوں نے نہایت کرم نوازی کر کے میری بیوی کی امداد فرمائی۔ حکومتِ آزاد کشمیر نے بھی وعدہ فرمایا کہ جو بل ان کے نام ہیں وہ ادا کر دے گی اور غالباً چند دنوں کے اندر ادا کر دیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا بلکہ آج تک بھی وہ سارے بل

ادا نہ ہو سکے۔ اور محض اہل فنانس کی بحث کا دلچسپ موضوع بنے رہے۔ غالباً ایک ربع صدی وقت گزر جائے گا پھر بھی وہ بل اہل فنانس کی تفنن طبع کا باعث بنے رہیں گے۔ یہ اہل فنانس بھی ایک عجیب وغریب قوم ہے۔ ان کی خاص ذہنیت ہوتی ہے۔ جو ان کے کردار اور شخصیت کا جزو بن کر رہ جاتی ہے۔ اس ذہنیت خاص کا وہ شکار بنے رہتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے اعتراض محض اعتراض کی خاطر کئے جاتے ہیں تاکہ یہ انکشاف ہو سکے کہ سائل کی طلب میں کس قدر سکت ہے۔ یہ اندازہ کرنا اس لئے بھی غالباً ضروری سمجھا گیا ہے کہ سائل کی طلب صحیح یا غلط ہونے کا بھی اندازہ ہو سکے۔ اگر سائل پہلے چکر میں ہی غائب ہو گیا یا اس نے ہتھیار ڈال دئے تو جان چھوٹی اور سائل اگر اپنے مطالبہ پر مصر رہا۔ بار بار آتا رہا تو اہل فنانس خود بھی ذہنی طور پر سمجھنے لگتے ہیں کہ مطالبہ میں کچھ جان ہے۔ کئی چکر کٹوانے کے بعد اصل مسئلہ پر متانت سے غور ہونے کے امکان وجود میں آتے ہیں۔

خیر بات ذرا اصل مطلب سے دور نکل گئی جس وفد کے ممبر ہونے کا مجھے اعزاز بخشا گیا اس کے لیڈر خواجہ شہاب الدین صاحب تھے۔ یہ خواجہ ناظم الدین کے برادر حقیقی ہیں۔ ان کے ساتھ میرے تعلقات دیرینہ ہیں۔ ان کے فرزند خواجہ ذکی الدین میرے ساتھ ولایت میں پڑھتے تھے۔ آج کل خواجہ ذکی الدین سٹیٹ بنک میں ملازم ہیں۔ خواجہ صاحب کے متعلق یہ زیادہ مشہور ہے کہ وہ شاطر ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ ناظم الدین صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ

وہ شریف ہیں اور کھانا زیادہ کھاتے ہیں۔ خواجہ شہاب الدین نہایت شرافت اور بلند اخلاقی کے ساتھ ہم سے برتاؤ کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ۵۰ ہزار میل کا ہوائی سفر نصیب ہوا۔ افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقی ایشیا کے تمام ممالک کا دورہ میں نے کیا۔ کسی بھی مرحلہ پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے شرافت کو نہ جانے دیا۔ سارے وفد کی حوصلہ افزائی کی۔ ہر طرح سے مسئلہ کشمیر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ گو کہ وہ عمر میں ساٹھ سال سے تجاوز کر چکے ہیں مگر انہوں نے سفر کی کوفت ہمت اور استقلال سے برداشت کی۔ ان کی صحت بہت ہی اچھی ہو گئی۔ ان کی نظر کمزور ہے۔ اس کمزوری کو بھی سفر میں حائل نہ ہونے دیا۔

کراچی سے بیروت پہنچ کر ہم نے پریس میں بیان دینے شروع کئے۔ روم میں ایک رات کا قیام تھا۔ روم میں پہلی بار گیا تھا۔ وہاں کے اہلِ پریس سے معمولی سی ملاقات ہوئی۔ بیگم لیاقت علی خان صاحبہ نے ہر بار ہم سے ملنے سے گریز کیا۔ شاید انہیں خواجہ صاحب سے کچھ اختلاف تھا۔ مجھ پر تو مہربان ہی رہی تھیں۔ کیونکہ دوسری بار جب ہم براستہ سپین روم سے گزرے تو بیگم صاحبہ نے ملنے سے گریز نہ کیا۔ یورپ کے ملکوں میں معاملہ کشمیر ایک دور دیس کا معاملہ ہے۔ اس میں دلچسپی پیدا کرنا ایک دن کی بات نہیں ہے متواتر کوشش کی بات ہے۔ پریس سے لگاتار تعلق پیدا کر کے آہستہ آہستہ رائے عامہ اپنے حق میں کرنے کی مستقل جد وجہد کی ضرورت ہے جو ہمارے ملک کے سفارتخانے ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ اب غالباً کچھ توجہ دے بھی رہے ہیں۔ ایسا کرنے

کے لئے بے بہا پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر سفارتخانے نے یہی شکایت کی کہ انہیں فنڈز نہیں دیئے جاتے غالبًا ان کی اس شکایت میں کچھ وزن ہوگا۔ ہمارے وفد کو یہ شکایت سارے دورہ میں دامن گیر رہی۔ چنانچہ جب ڈیڑھ ماہ کے دورہ کے بعد وفد کراچی پہنچا تو میرے ہوٹل کے بل بھی محکمہ وزارتِ امور خارجہ کے افسروں نے دینے سے انکار کیا۔ مجھے تو دوستوں سے قرضہ اٹھا کر یہ بل ادا کرنے پڑے۔ بڑی حکومتوں کے ایسے اطوار ہونے نہیں چاہئیں۔ ایسی باتوں سے ملک کی خدمت نہیں ہوسکتی۔ غالبًا ان افسران کے پاس شاید جواز ایسی باتوں کے لئے موجود ہو اور مجھے ایسے جواز کی تفصیل سن کر خوشی اور ذہنی تسلی ضرور ہوگی۔

افریقہ جاگ رہا ہے

سارے افریقہ میں ایک انقلاب پرورش پارہا ہے۔ میری اس آپ بیتی میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں ان تفاصیل کا ذکر کروں۔ افریقہ غلامی سے آزاد ہوکر اُبھرنا چاہتا ہے اور دنیا کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ واقعی "کالا" افریقہ آزاد ہے مگر ذہنیت جو اس مظاہرہ کے پس پردہ کام کررہی ہے وہ احساس کمتری ہے۔ اس لئے آزادی کا دعویٰ جب بھی ہوتا ہے تو وہ زور سے ہوتا ہے۔ ایسے دعویٰ میں توازن نہیں رہتا۔ دوسروں پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ افریقہ والے یہ صاف کہنا چاہتے ہیں "اب ہم غلام نہیں ہیں۔ آزاد ہیں۔ کیا تم یہ سمجھ چکے ہو کہ نہیں!" ابھی تک وہ گہرائی۔ وہ ذہنی سکون ان کو حاصل نہیں ہوا۔ یہ فطرتی بات ہے۔ یہ غیر فطرتی مظاہرہ نہیں ہے۔ بعینہٖ اسی طرح

ہے جس طرح کہ ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہونے کے بعد فطری اور قدرتی طور پر اپنی زندگی کا ثبوت دینا چاہتا ہے۔ یہ بھی اسی قسم کا مظاہرہ ہے۔ اگر آپ کا ذہن اس معاملہ کی تہ تک جلدی سے پہنچ جائے تو کسی قسم کی تشویش نہیں ہوتی۔ ورنہ آپ ان لوگوں کے متعلق غلط تاثر قبول کر کے ان کو ہر قسم کے الزام کا مورد ٹھہرانے لگیں گے۔

کشمیر کے متعلق سارے افریقہ کی ہمدردیاں کشمیر والوں کے ساتھ تھیں۔ جب افریقہ والوں کے سامنے اہل کشمیر کی غلامی کی صحیح تصویر کھینچی جائے تو فوراً یہ اثر قبول لیتے ہیں کہ کشمیریوں پر ظلم ہو رہا ہے کیونکہ ان کی اپنی تاریخ اور پچھلے چند سالوں کی تاریخ یہی رہی ہے۔ ہندوستان کے ظلم و تشدد کی تصویر جب کھینچی جائے تو اہل کشمیر کے ساتھ افریقہ والوں کی ہمدردیاں کھنچی آتی ہیں۔ چنانچہ آئیوری کوسٹ (IVERY COAST) اور گھانا کے صدروں کے سامنے میں نے ان مظالم کی تصویر کھینچی تو گھانا کے صدر نکرومہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ انہوں نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ نہرو صاحب کو فوراً خط لکھیں گے۔ اس وقت پنڈت نہرو ابھی تک زندہ تھے۔

نائیجیریا ۔۔۔ ۹

افریقہ میں کئی ایسے ملک ہیں جو مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں جیسے نائیجیریا۔ مگر نائیجیریا میں سب سے زیادہ ہم مایوس ہوئے۔ وہاں کے مسلمان خود دبے ہوئے ہیں۔ لاعلمی اور جہالت کا شکار ہیں۔ دوسرے غیر مسلم ان سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ان سے مسلمان ہونے کی حیثیت سے کوئی

توقع رکھنا بیکار ہے۔ اگر افریقہ سے کسی امداد کی توقع ہو سکتی ہے تو محض انسانیت اور آزادی کے نام پر ہو سکتی ہے۔ یہی بات ان کے دل لگتی ہے۔ یہی کہانی ہے جس سے وہ واقف ہیں۔ جوان کے ذہن میں فوراً اتر تی ہے۔ جس ہیبت اور دردناک کہانی سے وہ خود سالہا سال سے دوچار رہے ہوں، اس مصیبت میں دوسری قوموں کو دیکھ کر وہ فوراً پریشان ہوتے ہیں اور ان کی امداد کے لئے کھڑے ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ نگاہ ہے جو موجودہ دنیا میں اچھی طرح پیش کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ الجیریا کے مسلمانوں کی جنگ آزادی فرانس کے خلاف لڑی گئی وہی کشمیر میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اسی طرز پر جب بھی آزادی کی جنگ کشمیر میں لڑی جائے گی، کامیابی قدم چومے گی۔ تاریخی طور پر بھی یہی بات درست ہے کہ کشمیر کی آزادی کے لئے اہل کشمیر لڑیں۔ اپنی جانی و مالی قربانیاں پیش کریں۔ پھر آزادی کی نعمت سے فطرتی طور پر لطف اٹھائیں گے۔ اللہ کرے کہ پاکستان کے پالیسی بنانے والے یہ بات ہی، ذہن نشین کر لیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ بات پالیسی بنانے والے کبھی اپنا نہیں سکتے۔ اسکی وجوہات وہی زیادہ جانتے ہیں۔ انقلاب سے امن پسند اور نازک مزاج لوگ ڈرتے ہیں۔ مگر انقلاب کے بغیر ملک آزاد بھی تو نہیں ہو سکتے۔

کینیا جیسے حصوں میں ہندوستان اور پاکستان کے لوگ ایک دن مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے۔ انہیں وہاں کے افریقی لوگ نکال پھینکیں گے۔ ان حصوں یعنی کینیا۔ یوگنڈا وغیرہ میں ان

لوگوں کا قتل وخون بھی ہونا عین ممکن بات ہے۔ میں نے اپنی تقریر یونیورسٹی میں کرنے کا موقعہ مجھے ملا وہاں انہیں انتباہ کیا کہ ایسے حالات کا مقابلہ آج ہی وہ اپنے رویہ کی تبدیلی سے کرنا شروع کر دیں۔ اہل افریقہ کو اپنے بھائی سمجھ کر ہی وہاں ہند و پاک نسل کے لوگ رہ سکتے ہیں۔ ورنہ ایک اور اقتصادی انقلاب آئے گا جس کا شکار وہ سارے لوگ ہو جائیں گے جن کے پاس دولت ہے۔

اتحاد کا فقدان

افریقہ کی ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی اتفاق سے نہیں رہ سکیں گی۔ ان کی باہمی ناانصافیاں ان کے راستے میں حائل ہو رہی ہیں۔ ان کی اقتصادی دوڑ اور حسد کی وجہ آپس میں جنگ وجدال کا پیش خیمہ ہو سکتی ہیں۔ چونکہ وہاں ابھی سیاست پختہ نہیں ہوئی اور سیاستدان تجربہ کار نہیں ہو سکے۔ اس لئے بھی افریقہ کے معاملات نو آموز سیاستدان کی ناتجربہ کاری کا شکار ہو کر کسی ناخوشگوار جنگ کی نذر ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کے خلاف ایک بڑا الزام یہ ہے کہ ہندوستان افریقہ کو اپنی کالونی بنانا چاہتا ہے اس لئے پاکستان پوری طرح افریقہ کے ملکوں سے دوستی قائم کر سکتا ہے جو پاکستانی افسر سمالیہ میں کام کر کے آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کے لئے ایک بے مثال نام چھوڑا ہے اور پاکستان کی ان چند افسروں کی وجہ سے بے حد عزت ہوتی ہے اور میرے لئے یہ بڑی مسرت کا

باعث ہوا کہ پاکستان کی سمالیہ کے افسر اور حکومت والے بہت عزت کرتے ہیں۔
اس ملک میں ہم صحیح طور پر گردن اونچی کر کے چل سکے تھے۔ مگر وہاں
بے حد گرمی تھی، تین دن بسر کرنے سے قیامت دکھائی دیتی تھی۔ وہاں کے لوگوں کے
حسنِ سلوک سے ہمارا وہاں کا دورہ بے حد خوشگوار گزرا۔ سمالیہ میں عربوں اور افریقہ
والوں کے میل جول سے قوم بنی ہے جو باقی اہل افریقہ سے کافی مختلف ہیں۔ عربی
بولتے ہیں۔ یا اوپر کے طبقہ کے لوگ اٹلی کی زبان بولتے ہیں۔

انگریزی بولنے والے افریقہ میں ہمارے لئے بڑی آسانی رہی۔ کیونکہ وہ زبان
سمجھتے تھے۔ گفتگو میں آسانی رہتی تھی۔ جہاں اہل فرانس رہے ہیں وہاں وہ اپنی
تہذیب خوبصورتی سے چھوڑ گئے ہیں۔ ان علاقوں میں فرانس والوں کی تہذیب
اور تمدن خوبی سے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں کے لوگ اس قدر نفاست پسند ہیں اور
اتنی خوبی سے گفتگو کرتے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ فرانس افریقہ میں بھی
جہاں اس کی نو آبادیاں تھیں پوری طرح افریقہ والوں میں اپنی تہذیب و تمدن
کی خوبیاں چھوڑ گیا ہے یہ اہل افریقہ بھی طرز گفتگو اور روزمرہ کے رویہ میں اہل فرانس
سے مشابہ ہیں۔ اس کے برعکس انگریز ایسی کوئی بات اپنی نو آبادیات میں نہیں چھوڑ
گئے ہیں اور یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوتی ہے۔

افریقہ کے لوگ ایک پاکیزہ ولولے ساتھ ایک نئی زندگی سے ہم کنار ہونا
چاہتے ہیں۔ انہیں موسیقی (مغربی موسیقی) کا بے حد شوق ہے۔ گلی کوچے میں چلتے
پھرتے رقص کناں ہو جاتے ہیں۔ ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے
چہروں کی مسکراہٹ ایک کشش پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی عورتیں

اپنی جگہ حسین ہیں مصنوعی بال سر پر رکھتی ہیں۔ ان کے اپنے قدرتی بال اچھے نہیں ہوتے اور زیادہ ہوتے بھی نہیں ہیں۔ افریقہ کے اونچے طبقے کے لوگ ہر پارٹی، مجلس میں شراب فوراً پینے لگتے ہیں اور اتنی پی لیتے ہیں کہ مخمور ہو جاتے ہیں اور خمار کی حالت میں بے حد جذباتی ہو جاتے ہیں۔ افریقہ کا نیا ابھار دیکھ کر انسان کو فخر محسوس ہوتا ہے۔ یہ پورا براعظم جو چند سال قبل غلام تھا۔ اب کلیتہً آزاد ہے وہاں ایک انقلاب نے پرورش پائی ہے۔ اور آزادی کیلئے لاکھوں انسانوں نے قربانیاں پیش کی ہیں مگر اقتصادی طور پر افریقہ آزاد نہیں ہے۔ بلکہ ابھی اہلِ یورپ سارے کاروبار پر حاوی ہیں۔ جو باقی رہا سہا کاروبار ہے اس پر کچھ علاقوں میں اہلِ ہندوستان قابض ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقتصادی انقلاب بڑی بے دردی سے آنے والا ہے۔ یہاں امن ہونے کی مجھے بہت کم امید ہے۔

ترکی اور عرب ممالک

ترکی اور عرب ممالک کا مختصر سا دورہ بھی ہمارے وفد نے کیا۔ ترکی ہمارے بے حد نزدیک ہے۔ خصوصاً قبرص میں ہماری حمایت نے انہیں ہمارے نزدیک کر دیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ترکی مخلصانہ طور پر ہم سے دوستی کی پرورش کرنا چاہتا ہے۔ اس دوستی پر اہلِ پاکستان کو بجا طور پر فخر کرنا چاہیئے۔ ترک عربوں کے سخت مخالف ہیں کیونکہ مصر نے قبرص میں ترکوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اہلِ یونان کا ساتھ دیا۔ ہتھیار ترکوں کے خلاف مصر سے یونان اور یونان سے اہلِ قبرص کو دیے اس سے ترک عربوں کے سخت مخالف ہیں۔ ترک کے صدر نے اس ساری دردناک کہانی پر روشنی ڈالی۔ ایک گھنٹہ بھر مذہب پر تقریر کی۔ اور یہ تلقین کی کہ عربی میں قرآن پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ ہمارے قائد وفد خواجہ شہاب الدین

نے مؤدبانہ طریق سے اس بات کی تردید کی مگر کے صدر عربوں کے خلاف اس قدر تلخی رکھتے تھے کہ معاملہ بحث و تمحیص کے مرحلہ سے غالباً آگے گزر چکا ہے۔

مصر میں کشمیر کے مسئلہ کے ساتھ اس قدر ہمدردی نہیں ہے۔ یہ ہمدردی ابتداء میں کافی تھی مگر مصر ہندوستان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ مصر میں عرب نیشنلزم کا زیادہ پرچار ہوتا ہے۔ دین اسلام کوئی مضبوط رشتہ مسلمان ملکوں میں اب نہیں رہا۔ یہ تاثر میں نے قاہرہ اور بیروت میں مختصر قیام کے دوران قبول کیا۔ کاش کہ یہ تاثر غلط ہو۔ یہ بھی میری دعا ہے کہ اللہ کرے مسلمان ملک اسلامی رشتہ کی وجہ سے اور نزدیک آجائیں۔ اس طرح یہ اقتصادی اور سیاسی تعاون میں مضبوط ہو جائیں گے۔

ملائشیا کا کردار

کراچی دو روز قیام کے بعد میں ہوائی جہاز سے بنکاک ہوتا ہوا سنگاپور پہنچا۔ میرا دورہ کولمبو ہوتا ہوا ملائیشیا گیا ہوا تھا۔ ملائیشیا کی حکومت نے میرے وہاں آنے پر رضامندی ظاہر نہ کی تھی۔ چونکہ میں نے کشمیر میں انقلابی حکومت تشکیل دی تھی۔ اسی وجہ سے ملائیشیا کی حکومت مجھے اپنے دارالحکومت میں مہمان نہیں بنا سکتی تھی۔ انڈونیشیا کی جانب سے ایسی انقلابی حکومت بنائے جانے کے منصوبے ملائیشیا حکومت کو پریشان کر رہے تھے۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا کی باہمی چپقلش میں ہندوستان نے ملائیشیا کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے ملائیشیا ہندوستان کو اپنا دوست سمجھ رہا تھا۔ کچھ ہندو لوگ ملائیشیا کی سرزمین میں آباد ہیں۔ ان کی وجہ سے بھی ملائیشیا کی حکومت مرعوب تھی۔ حکومت ہندوستان کے خلاف پراپیگنڈہ اس نازک وقت میں ملائیشیا کی حکومت برداشت نہ کر سکتی تھی۔ انڈونیشیا گو چند سال پہلے ہندوستان کا دوست تھا مگر اب پاکستان کے نزدیک آرہا تھا۔ یہ محض ان کے ملائیشیا سے

اختلاف کی وجہ تھی۔ اسی بنا پر ہندوستان سے بھی ان کے تعلقات خاصے کشیدہ ہو گئے تھے۔ جکارتہ میں ہمیں مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ صدر صاحب نے ملاقات بخشی مگر کشمیر پر واضح بات کرنے سے وہ بھی گھبرائے اور معمولی سی حمایت کا اعلان کرنے پر بڑی خوشامد کے بعد رضامند ہوئے۔

یہی حالات جاپان میں تھے۔ وزیر اعظم سے ملاقات کے بعد انہوں نے بھی خاصی حمایت کا اعلان کیا۔ یہ ہمارے لئے کافی کامیابی تھی۔ سفارت خانہ پاکستان والوں نے ہمیں پہلے ہی یہ یقین دلایا تھا کہ حکومت کی جانب سے حمایت کی توقع قطعاً نہیں ہو سکتی۔ ہماری توقعات سے بعید حکومت جاپان کی حمایت ہماری بڑی کامیابی تھی۔

فلپائن کی حکومت ہمارے زیادہ نزدیک ہے۔ وہ ہمارے نزدیک سیٹو کے حلیف ہیں۔ وہ چھوٹی حکومت ہے۔ جنرل رومولو سے الگ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مختلف اوقات اور مقامات پر ہماری حمایت کی ہوئی تھی۔ فلپائن میں کچھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ یہ سات ہزار جزیروں کا ملک ہے۔ ایک حصہ میں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ مسلمان بہت ہی پسماندہ ہیں۔ ہمارے لئے ایک چھوٹی سی میٹنگ بھی ہوئی۔ مگر یہ میٹنگ بے حد مایوس کن تھی۔

جاپان کی ترقی

ایشیا کے اس حصہ میں جاپان بے حد ترقی پذیر ہے۔ جاپان یقیناً صنعتی ترقی میں دنیا کے اوّل ترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ سمندری جہازوں کے بنانے میں جاپان اس وقت اوّل نمبر پر ہے۔ یہ ہمارے سفیر صاحب مقیم ٹوکیو نے ہم پر اچھی طرح واضح کیا۔ انگلینڈ نے (جو جہاز بنانے والی پہلی قوم تھی

بھی جاپان کو سمندری جہاز بنانے کے آرڈر دیئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ٹرانسسٹر ریڈیو ان کی ایجاد ہے۔ اس کے بنانے والوں میں سرفہرست ان کا نام ہے۔ جاپان بیحد ترقی کر رہا ہے اور چند سالوں میں کرے گا۔ اس کے لئے ایک الگ کتاب لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ ان سطور میں یہ اندازہ لگانا کہ جاپان کس قدر ترقی کتنی تھوڑی مدت میں کر رہا ہے بہت ہی مشکل ہے۔

ہم لوگوں کا قیام چار روز ٹوکیو میں رہا۔ اس قلیل مدت میں انسان کتنی اطلاعات جاپان کے حالات کے متعلق حاصل کر سکتا ہے، ٹوکیو میں چار دن کے قیام سے علم ہوا کہ سوشل اور تمدنی طور پر جاپان مغرب کے بڑے ملکوں میں ہی شمار کیا جا سکتا ہے۔ جاپان میں ہر سال ہزاروں سیّاح محض سیاحت کرنے آتے ہیں۔ اور اہلِ جاپان کی عورتیں انہیں اس قدر آرام اور آسائش سے اپنے ملک میں رکھتی ہیں۔ کہ بہت سے امریکن ان سے شادی کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ جاپان کی ”گیشا“ لڑکی ”سوکیا کی“ کھانا اور ساکی چاول کا پانی بڑی دلچسپ چیز ہیں۔

میرا مختصر سا تجربہ جو اس بارے میں ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ جاپان کی عورت نے اس معاملہ میں کس قدر صحیح ٹیکنیک کو اپنا کر معراج تک پہنچایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کے سیاح اس ملک کی جانب کھنچے جاتے ہیں اور یہ سیاح جاپان کے لئے کروڑوں روپے کے بیرونی زرِ مبادلہ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جاپان کی ملکی تجارت کو کروڑوں روپے سال کا فائدہ پہنچتا ہے ”سوکیا کی“ ایک خاص قسم کا کھانا ہے۔ جو کہ نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا پڑتا ہے۔ جوتیاں باہر اتارنی پڑتی ہیں۔ پھر ایک خوب صورت چھوٹے کمرے میں آپ کو بصد اہتمام و احترام لے جایا جاتا ہے۔ اس کمرے کی چھت خاصی

نیچی ہو جاتی ہے۔ لکڑی سے سارے مکان کی بناوٹ عجیب و غریب تخلیق کی گئی ہے۔

کمرے کے درمیان ایک لمبوتری کھدی ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ اس کے کنارے پر آپ ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے ایک میز رکھ دیا جاتا ہے جو ساری کھدی ہوئی جگہ کے اوپر آجاتا ہے پھر ایک نہایت ہی حسین لڑکی آتی ہے۔ جو ادب و احترام سے جھک کر آپ سب کو سلام کرتی ہے (اگر آپ ایک سے زائد ہوں تو) پھر شستہ انگریزی زبان میں آپ سے محو گفتگو ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی سارا کچا کھانا اس میز پر قرینے سے لگاتی ہے۔ جب بھی آپ اس سے مخاطب ہوں تو ادب سے جھک کر گھٹنوں کے بل ہو جاتی ہے آپ سے بات بھی کرتی ہے۔ سٹوو پر کھانا بھی پکاتی ہے۔ جوں جوں پکتا جاتا ہے آپ کو کھلاتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر آپ "ساکی" پینے کے شائق ہوں تو پلاتی جاتی ہے۔ سارا کمرہ ایک گڑیا کے گھر کی طرح سجا یا ہوا ہوتا ہے جس کا عجب رومانی ماحول ہوتا ہے۔ یہ سارا کھانا یعنی "سوکیا کی" اور لڑکی "گیشا" اس قدر دلچسپ بن جاتی ہیں کہ اس قسم کا "نظام" سارے یورپ اور امریکہ میں پھر جائیے کہیں بھی آپ کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ پھر اس قدر بے تکلفی اور اطمینان کے ساتھ۔

اس طرح آپ رات کے دوران بس پر نکل جائیں۔ یا جا کر حمام کی سیر کریں جاپان کی یہ "گیشا" آپ کی صحیح خدمت کے لئے تیار رہے۔ اس میں کوئی تکلف یا بناوٹ کا پہلو نہیں ہوتا۔ اس سارے قصہ میں کوئی اخلاق سے گری ہوئی بات آپ کے نوٹس میں نہیں آئے گی۔ نہ ہی آپ میری اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ ان باتوں میں کوئی بُرا پہلو بھی ہے۔ ہرگز نہیں کم از کم میرے نوٹس میں ایسی

کوئی بات نہیں آئی۔

ہوٹل میں جو کمرے ہم لوگوں کو ملے تھے وہ اس قدر چھوٹے تھے کہ بجائے خود ایک عجیب بات تھی جب ہم لوگ جاپان پہنچے ہمارے سارے الاؤنس کی رقم خرچ ہو چکی تھی۔ ہم سفارت خانہ سے قرض لے کر ایک چھوٹے سے مگر نئے ہوٹل میں وارد ہوئے۔ وہاں بھی سفارت خانہ کی خاص سفارش ہونے پر مایہ کمرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ اگر اسے چوہے اور چوہیا کا گھر کہہ دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ میں تو مختصر سا انسان ہوں۔ خواجہ شہاب الدین صاحب مجھ سے زیادہ مختصر انسان ہیں مگر ہمارے دوسرے دو ساتھی اس طرح اس کمرے میں اندر داخل کر دیے گئے جس طرح ایک ہاتھی کو چھوٹی سی گاڑی کے گیراج میں گھسیڑ دیا جائے۔

ان دنوں اولمپک کی تیاری ٹوکیو میں ہو رہی تھی۔ اور کسی جانب زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ ابھی تک سردیاں رخصت ہو رہی تھیں۔ کشمیر سے ملتا جلتا موسم تھا۔ درختوں سے نرم نرم پتے نکل رہے تھے۔ ترکی میں بھی ہم نے ایسا موسم دیکھا تھا۔ ورنہ ہمارا سارا کا سارا سفر گرمی اور گرم ملکوں میں ہوا تھا۔ ماسوائے نیروبی شہر کے جو دنیا کی خوبصورت ترین جگہوں میں شمار ہونے کا اہل ہے۔

اپنے اس سفر میں ہم نے ۵۰ ہزار میل کا ہوائی سفر کیا۔ افریقہ اور یورپ اور سارے مشرقی ایشیا کا دورہ مکمل کیا۔ اس دورے کے دوران افریقہ کی حبشی قوموں سے لے کر یورپ کے سفید فام انسانوں سے ملے۔ پھر لنکا سے ہو کر بنکاک اور ملائیشیا میں چین کے لوگوں سے ملنا ہوا۔ یہ سارا سفر ۷۵ روز میں مکمل ہوا اور ساٹھویں دن واپس راولپنڈی اپنے بیوی بچوں میں تھا۔

دلچسپ مناظر

جب ہم لوگ روم سے روانہ ہوئے صبح کا وقت تھا۔ سورج دھیمے دھیمے چڑھ رہا تھا۔ روم کے اوپر سورج میں گرمی نہ تھی نہ ہو سکتی تھی۔ ہمارا جہاز پرانے روم کے کھنڈرات کے اوپر سے اڑا۔ سارا منظر ہماری نظروں کے نیچے تھا۔ مجھے جہاز میں دروازہ کے ساتھ لگ کر باہر دیکھنے میں بے حد لطف آتا ہے۔ کئی مسافر جہاز پر بیٹھ کر رسالے منگوا کر پڑھنے لگتے ہیں۔ کئی مسافر سو جاتے ہیں گورمانی صاحب ہوائی جہاز کی سیٹ پر سو کر اس قدر زور سے خراٹے لے سکتے ہیں کہ پانچویں انجن کا گمان ہونے لگتا ہے ان کے ساتھ میں نے ۱۹۵۰ء میں لندن سے امریکہ کا سفر کیا تھا۔ ان کا حقہ بھی ساتھ تھا۔ وہ بھی دلچسپی کا سامان تھا۔

روم سے اڑ کر آپ نے بحیرہ روم سے گزرنا ہوتا ہے۔ یہ سمندر سبز دکھائی دیتا ہے۔ دور دور کچھ جزیرے ستاروں کی مانند اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس نیلے سمندر پر جب سورج چمکتا ہے یہ نظارہ بے حد دلکش ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے جہاز اس سمندر کی چھاتی پر تیرتے ہوئے بھی ستاروں کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں۔ یہ جہاز یعنی آپ کا اپنا ہوائی جہاز دھیرے دھیرے (کیونکہ اس کے بیچ میں بیٹھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دھیرے دھیرے منزلیں طے کر رہا ہے) سمندر عبور کر کے شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم پر سے گزرتا ہے۔ یہ سارا منظر بے حد دل فریب ہے۔ ہم بیروت سے براستہ مصر و سوڈان خرطوم جا رہے تھے ہمارا جہاز ایک دن بیروت روک لیا گیا۔ کیونکہ مصر کے ہوائی اڈے پر طوفان تھا۔ "خمسین" اچل رہی تھیں۔ "خمسین" اس موسم کی ہوائیں ہیں۔ جب قاہرہ کے ہوائی اڈے سے ہم شام کو چار پانچ بجے اڑے۔ تو دریائے نیل کے کنارے

کنارے سفر ہوا خوشگوار موسم تھا سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہماری بلندی لگ بھگ بیس ہزار فٹ کے لگ بھگ ہو گی۔ ڈوبتے ہوئے سورج نے سرخی سے سارے ماحول کو رنگ دیا۔ یہ سرخی گہری تھی۔ سارے دریائے نیل کو اس سرخی میں رنگ دیا گیا۔ یہ سرخی ڈیڑھ گھنٹہ تک رہی ہو گی۔ اس سارے منظر کو دیکھ کر مجھے اس قدر مسرت ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اس لمحہ اللہ کے نزدیک تر اس کے خوب صورت ترین ماحول سے ہمکنار ہوں۔ اپنی ساری زندگی میں ایسے مناظر میں نے کم دیکھے ہیں۔

اسی طرح کا تیسرا منظر بھی آپ سے بیان کئے دیتا ہوں۔ وہ بھی اسی قدر پرلطف ہے۔ کراچی سے ۲ بجے صبح ایئر فرانس کے جہاز پر سوار ہوا۔ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ بے حد نیند تھی۔ خدشہ یہ تھا کہ جہاز پر سوار ہو کر نیند نہ آئے گی میرے ساتھی پہلے جا چکے تھے۔ کراچی سے میں ہی اکیلا مسافر تھا جو اس جہاز پر سوار ہوا۔ یہ بوئنگ ۷۰۷ تھا۔ مسافر پہلے سے ہی محو نیند تھے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی آہستہ آہستہ مزے سے نیند آ گئی۔ بنکاک کے نزدیک ہی ہوں گے۔ سیٹ پر سے آہستہ سے جہاز کی میزبان لڑکی نے مجھے جگایا یہ جگانے کا حصہ نہایت ہی نرم و نازک تھا۔ اس کی تفصیل میں الفاظ میں بیان کرنے سے بیشک قاصر ہوں۔ میرے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اہل فرانس کس قدر نفاست کا مظاہرہ کر سکتے ہیں!۔ اس حسین لڑکی نے میرے آگے کی کھڑکی کا پردہ اٹھایا اور مجھے باہر کے منظر کی طرف اشارہ کر کے دیکھنے کی دعوت دی۔ نیچے میل ہا میل تک پھیلا ہوا سمندر تھا۔ جو ایک غیر معمولی نیلا سبز منظر پیش کر رہا تھا۔ دور دور مشرق سے سورج جھلملاتا ہوا ابھر رہا تھا۔ جوں جوں اوپر ابھرتا تھا۔ اس کی شعاعیں سمندر

کے کونے کونے تک پھیلی جا رہی تھیں۔ سارا سمندر سنہری رنگ میں رنگا رنگا جلنے لگا تھا۔ ایک خفیف سی تھرتھراہٹ کا شکار ہوتا تھا۔ ساری سطح سمندر ایک حسینہ کی طرح کروٹ بدلنے کو تھی۔ زمین کسی طرف بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

چند لمحوں میں اس جہاز کی میزبان لڑکی نے گرم پانی میں نچوڑے ہوئے تولیہ سے منہ دھلایا جیسے ہم مسافر ایک گڑیا کی مانند ہیں۔ ایک اہتمام کے ساتھ منہ دھلانے کا معاملہ طے پاتا ہے گو مسافر غسل خانہ میں بھی منہ دھو سکتے ہیں۔ اس سارے ماحول نے میرے دل و دماغ پر ایک عجیب اثر پیدا کیا۔ میری روح کو عجیب و غریب بلندیاں نصیب ہونے لگیں۔ یہ روح کی پرواز کچھ اس طرح ہوئی کہ ساری زندگی میں کوئی ایسا تجربہ مجھے نصیب نہ ہوا تھا۔ فرانس والوں کی زبان میں مائیکروفون پر دوسری لڑکی نے بنکاک پہنچنے کا اعلان کیا۔ میلوں تک میدان اور اس کے اوپر سڑک لیٹی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ جہاز دیکھتے دیکھتے ان بلندیوں سے اللہ کی زمین پر آیا۔ ایک جھٹکے سے زمین پر اترنے سے اس دنیا کی زندگی کا احساس ہونے لگا۔

انسانوں کی دنیا

دنیا میں ماں باپ سے لے کر اپنے بھائیوں اور بہنوں سے ابتداً زندگی نبھانا پڑتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے پڑوسی آپ کے ہجول بنتے ہیں۔ سکول کالج کے رنگین ماحول نوجوان لوگوں سے آپ کے دوستانہ تعلقات پرورش پا کر آپ ایک آدمی بن جاتے ہیں۔ کالج سے فارغ ہو کر آپ زندگی میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے مرد اور عورتوں سے ہر روز ہر لمحہ دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

اس ساری زندگی میں انسانوں کے علاوہ آپ اپنے ماحول کی مختلف کیفیتوں سے اثر قبول کرتے ہیں۔ پہاڑ کے رہنے والے آسمان بوس پہاڑوں۔ ندی نالوں سرسبز جنگلوں اور ان جنگلوں میں پرندوں کی موسیقی سے اس طرح اثر قبول کرتے ہیں۔ جس طرح مکی اور گندم کے چڑھتے ہوئے پودے سورج کی دھوپ سے قبول کرتے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو قدرتی مناظر کے حسین اثرات سے محروم رہتے ہیں۔ میری زندگی پہاڑوں جنگلوں اور دریاؤں کے ماحول کی پیداوار ہے۔ ان پہاڑوں کی بلندیوں نے دریاؤں کی گہرائیوں اور جنگلوں کے سبز مناظر نے اپنی اپنی جگہ نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ میری زندگی کی تصویروں میں رنگ بھرے ہیں۔ اس معاملہ میں بیحد حساس ہوں ہر قدرتی منظر مجھ میں خفتہ شاعر جگا کر رکھ دیتا ہے۔ ان قدرتی مناظر سے میں اس قدر محظوظ ہوتا ہوں کہ ایک قسم کے خمار کی کیفیت طاری ہوتی ہے (یہ مبالغہ نہیں ہے نہ ہی شاعری ہے) انسانوں کی دنیا بھی ایک پُر لطف دنیا ہے صرف صحیح رویہ اور نظریہ قائم کرنے کی ضرورت ہے میں نے ساری زندگی مختلف موقعوں پر انسانی حسن سلوک کے تجربات کر کے حظ اٹھایا ہے۔ کئی بار اپنی وکالت کے دوران دکھے ہوئے دلوں کو سہارا دے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی اس کا اثر میرے دل پر کیا ہوگا۔ یہ میری وکالت یا میرے پیشہ کا کوئی خاص حصہ نہیں تھا۔ یہ تجربہ بعض اوقات بے حد صحت بخش ہوتا ہے۔ کہ دوسرے کے دکھ کی دوا بن کر آپ پھر دل خود خوش رہتے ہیں۔ بعض اوقات دکھی لوگ درخواست لے کر آپ کے پاس بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ ان پر "ظلم" ہوا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں ان کی ساری داستان ظلم و ستم آپ تک پہنچنے کے بعد ان کی ساری مصیبت کا حل ہو جائے گا۔ یہ دور سے چل کر

غالباً پیدل منزلیں طے کر کے آئے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسی ایسی دکھی بے بس و بیکس عورتیں ہوتی ہیں۔ بیوہ عورتیں جن کی زمین چھین لی گئی ہوتی ہے۔ جن کا اکلوتا بیٹا قتل ہوا ہوتا ہے۔ جن کی معصوم بچی ان سے بالجبر چھینی گئی ہوتی ہے۔ بھاگم بھاگ منزلیں طے کر کے سانس چڑھے ہوئے ہزاروں دکھ دبائے ہوئے آپ تک رسائی غالباً سڑک کے کنارے ان کو نصیب ہوتی ہے پھر پولیس نزدیک آنے سے انہیں ڈراتی ہے اور آپ کی نظر بچا کر دو چار ڈنڈے بھی رسید کر دیتی ہے۔

اس لمحے آپ اپنی جیپ یا کار کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس بے کس عورت کو اپنے پاس بلواتے ہیں۔ ٹھنڈے دل اور میٹھے لہجہ میں اس سے بات کرتے ہیں۔ اس کی کہانی آرام سے سنتے ہیں (غالباً آپ کو اگلی منزل پر پہنچنا ہوتا ہے اور دیر بری طرح ہو رہی ہوتی ہے) اپنے وقت کی قربانی کرتے ہیں۔ سب سے اوّل اس ستم رسیدہ عورت کو اپنے منہ سے تسلی دیتے ہیں "سارا معاملہ ٹھیک کر دوں گا" بہ مت کہیں کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈی سی صاحب ٹھیک کر دیں گے مگر یہ سب باتیں اس کے لئے تسلی بخش نہیں ہیں کیونکہ ڈی سی۔ ایس پی والے سارے دروازے وہ کھٹکھٹا چکی ہوتی ہے۔ جب آپ اپنے حکم سے ٹھیک کرنے کی تسلّی دیتے ہیں۔ تب ہی وہ اطمینان و سکون کا سانس لیتی ہے۔ یہی اس کے ساتھ صحیح حسن سلوک ہے۔ ویسے یہ آپ کا فرض بھی ہے۔

اسی شام آپ اپنی کوٹھی پر میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پہنچیں گے۔ کئی درخواستوں والے وہاں بھی کھڑے ہوں گے۔ نوکریاں ڈھونڈنے والے سلام کے لئے حاضر ہوں گے۔ سیاسی کارکن جٹ کے

خوشحال آپ کے راستہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ دو دو ہاتھ سلام کریں گے "زندہ باد" کے نعرے لگائیں گے۔ اس ساری داستان کے یہ مرحلے طے کرنے کے بعد بچوں میں آپ بیٹھیں گے۔ کھانا کھائیں گے۔ بستر پر سونے کے لئے تھک کر لاہٹے پڑ جائیں گے تو بوڑھی کے ساتھ نیکی کا ایک حسین واقعہ آنکھوں کے سامنے چکر لگانے لگے گا۔ اس کے دعا مانگنے والے دو کھڑے ہاتھ آپ کو دکھائی دیں گے۔ آپ کا قطرہ قطرہ خون اپنی رگوں میں جھولے گا یہی بہشت ہے۔ ایسے کاموں سے انسانوں کو بہشت نصیب ہو سکتی ہے ——— اور میں ایسے ہی احساسات و جذبات اور اعمال کو لئے بہشت کی تلاش میں ہوں ——— انسانوں کی بہشت ——— جو انسانوں کے لئے ہو ——— اور جس کے لئے میں نے کئی بار دوزخ کی گرمی بھی برداشت کی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بہشت مل کر رہے گی۔ جہاں کوئی عورت ——— ظلم سے تنگ آکر داد رسی طلب نہ کرے گی۔ جہاں انصاف مہنگا نہیں ہوگا ——— جہاں کے عوام بھوکے نہیں ہوں گے ——— جہاں سیاست، تجارت نہیں ہو گی ——— جہاں کشمیر محکوم نہیں ہوگا ——— جہاں زندگی مقہور و مجبور نہیں ہو گی۔!!

اب قرآن حکیم کے ان ارشادات قدسیہ سے ختم کرتا ہوں کہ:-

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (ق)

"اس میں یقیناً نصیحت ہے۔ اس کے لئے جس کے پہلو میں دل ہو یا پوری توجہ کے ساتھ سُنے"۔

کشمیر کی جنگ آزادی کے اس مصنف ...
آزاد کشمیر کے مشہور کشمیری رہنما سردار محمد ابراہیم
خان ہیں جو متعدد بار حکومت آزاد کشمیر کے صدر
رہ چکے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت آزاد کشمیر
کے قیام اور تشکیل و تعمیر میں ان کی حیثیت ایک
بانی کی حیثیت رکھتی ہے اور زیر نظر تصنیف
سوانح و سرگزشت ہے جو انھوں نے ریاست جموں و
کشمیر کی سیاسی تاریخ اور تحریک جنگ آزادی کا
تذکرہ اپنی ذاتی زندگی کے حالات و کوائف کے
پس منظر میں کیا ہے اور طرز بے ساختہ انداز بیان
میں کیا ہے۔ آزادی کشمیر کے عوام اور وہاں کے
مسلمانان جموں و کشمیر کی بے مثال قربانی
اور اہل کشمیر کی بیس سالہ جدوجہد آزادی کی
تاریخ ایک کھلی کتاب سے ہم سب کے سامنے آ جاتی ہے

ادارہ

ناشر

سردار
محمد
ابراہیم
خان

۱۹۱۵ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے
میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۱ء میں قانون کی ڈگری لے
ہائی کورٹ سری نگر میں پریکٹس شروع کی
ایڈووکیٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں انہیں
مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں حکومت کی پالیسی
سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ جنوری
میں پونچھ کی طرف سے پھر منتخب ہوئے
کانفرنس کے چیف وہپ کی حیثیت سے کام کیا
صورت حال بالکل بدل گئی۔ اکتوبر ۴۷
ہوئے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء میں دوبار سلامتی
کا کیس پیش کیا۔ اور "میکناٹن تجاویز" کے
ہاتھ بنایا۔ مئی ۱۹۵۰ء میں مسلم کانفرنس سے
کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن اسے
کشمیر کو پوری طرح کامیاب بنانے میں مصروف
میں 'آزاد جموں و کشمیر حکومت' کے صدر چنے گئے۔
سے استعفیٰ دے دیا ———— آج کل لاہور
میں پریکٹس کرتے ہیں۔

- پونچھ ۔ لاہور اور لندن
سٹے ۔ ۱۹۴۳ء میں
راس سال گورنمنٹ
شپ ایڈووکیٹ جنرل
سے اختلافات کی بنا پر
۱۹۴ء میں ریاستی اسمبلی
اور اسمبلی میں مسلم
تقسیم کے بعد ریاست میں
ء میں آزاد کشمیر کے صدر منتخب
ونسل کے سامنے آزاد کشمیر
لے میں جنرل میکناٹن کا
ند اختلافات کی بنا پر آزاد کشمیر
باوجود تادم تحریر تحریک آزادی
میں ۔ پھر دوبارہ ۱۹۵۰ء
۱۹۵ء کے وسط میں صدارت
ائی کورٹ اور سپریم کورٹ